لکھنؤ کا چھوٹا امامباڑہ ہر سال محرم میں اسی طرح روشنی میں نہا جاتا ہے

پہلی محرم کو آصفی امامباڑے سے برآمد ہونے والے شاہی جلوس میں ذوالجناح

پہلی محرم کو آصفی امامباڑے سے برآمد ہونے والے شاہی جلوس میں حسین آباد ٹرسٹ کی مرکزی حیثیت رہتی ہے

جلد : ۷۲ شمارہ : ۷

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اکتوبر ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 115

Email:
nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

تصاویر: کشن سنگھ

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ایک سو دس روپے
فی شمارہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ رجسٹری:

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

مضامین

شاہی زمانے میں لکھنؤ کی عزاداری کی ایک جھلک ..... مسعود حسن رضوی ادیب ۹
مجلس شام غریباں ..... مولانا کلب جواد نقوی ۱۰
مرثیہ اور سوزخوانی کا فن ..... اولاد حسین شاعر ۱۳
حسینیہ غفرانمآب کے عہد بہ عہد حالات ..... مولانا مصطفیٰ حسین ۱۶
شاہی تہذیب عزا کا شہر لکھنؤ ..... نواب جعفر میر عبداللہ ۲۸
سلام ؛ رثائی ادب کی ایک اہم صنف ..... عابد حسین حیدری ۳۴
اردو غزل میں سانحۂ کربلا کا علامتی اظہار ..... ظفر النقی ۳۸
نوحہ گوئی کا تاریخی وتنقیدی جائزہ ..... شاہد کمال ۴۴

گزشتہ لکھنؤ

لکھنؤ کی تاریخی عزاداری ..... مرزا جعفر حسین ۲۰

اقتباسات

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے ..... قرۃ العین حیدر ۶۸
آخری شمع ..... عصمت چغتائی ۷۲

سلام

اسداللہ خاں غالبؔ ..... ۳ جونؔ ایلیا ۴
سید محمد حسن سالکؔ ..... ۴ سید حسین تاج ۵
عفیف سراج ..... ۵ ہلال نقوی ۶
سید عرفان حیدر زندگی پوری ..... ۶ کمیل شفیق رضوی ۷
قائم مہدی تذہیب نگروری ..... ۷ آل عبا ۸

مراثی

میر ببر علی انیسؔ ..... ۵۰ مرزا سلامت علی دبیرؔ ۵۲
میر تقی میرؔ ..... ۵۴ بہادر شاہ ظفر ۵۵
جمیل مظہری ..... ۵۶ فیض احمد فیض ۵۸
حفیظ جالندھری ..... ۵۹ صادق علی نقوی حسین جائسی ۶۰
روپ کماری ..... ۶۲ وحید اختر ۶۴
شوکت تھانوی ..... ۶۵ کیفی اعظمی ۶۶

نوحے

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی ..... ۷۵ میر خورشید علی نفیس ۷۵
مرزا محمد ہادی رسوا ..... ۷۶ آشفتہ چنگیزی ۷۶
عرفان صدیقی ..... ۷۷ میر حسن خلیق ۷۷
نجم آفندی ..... ۷۸ راجہ الفت رائے الفت ۷۸
لالہ چھنولال خادم میاں دلگیر ..... ۷۹ لالہ دھنپت رائے محب ۷۹
سید محمد اصطفا خورشید ..... ۸۰ رقیہ بانو ۸۰
شہید لکھنوی ..... ۸۱ اسداللہ خاں غالبؔ ۸۲

ترقیات

اتر پردیش ایک نئی سمت کی جانب گامزن ..... نجیب انصاری ۸۴

تاثرات

آپ کے خطوط ۸۸

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

انیسویں صدی کی ابتدا نے ہی لکھنؤ کو دو ایسے عظیم نوادرات سے نوازا جنھوں نے لکھنؤ کو ایک نئی شناخت سے روشناس کرایا۔ یہی وہ دو نوادرات تھے جو لکھنؤ کے ادب، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی عظمت کے علمبردار بن گئے، جنھیں دنیا میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ کے نام سے جانتی ہے۔ ہوش سنبھالے ہوئے کچھ عرصہ ہی گزرا تھا، نوجوانی کے دنوں کی آمد آمد تھی کہ لکھنؤ کو ایک اور دُر بے بہا نصیب ہوا جس نے لکھنؤ کے ادب اور فنون لطیفہ میں نئی نئی اصناف کی ترویج کی۔ وہ تھے اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ۔

جہاں اردو میں ان نابغۂ روزگار شخصیات سے پہلے بھی مرثیہ، سلام اور نوحے کہنے والے ماہرین موجود تھے اور عزاداری اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ پہلے جیسی برپا ہوتی تھی لیکن لکھنؤ کی عزاداری کا یہ جاہ و حشم اور لکھنؤ ہی کیا پوری اردو دنیا میں جہاں جہاں سوگواری اور عزاداری کے علم اٹھائے جاتے ہیں وہاں وہاں مرثیہ ہو یا نوحہ یا پھر سلام، انیسؔ و دبیرؔ کے بغیر بات بنتی نظر نہیں آتی۔

یہ بات کئی مرتبہ ادبی محفلوں میں زور پکڑ چکی ہے اور شرفاء میں اکثر اس پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے کہ کیا صرف محض تاجداران اودھ کی وجہ سے ہی لکھنؤ کے محرم نے مذہبی رسومات کی حدود سے نکل کر اپنی ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی حیثیت قائم کر لی۔

بے پناہ ادبی اور فنی صلاحیتوں کے مالک نواب واجد علی شاہ نے جب اودھ کی عنان حکومت سنبھالی تو انہیں لکھنؤ کی تہذیبی وراثت میں میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ ملے، اسے کون سا مرکب کہا جائے یا محض ایک اتفاق کہ اگر انیسؔ و دبیرؔ لکھنؤ میں نہ پیدا ہوتے تو شاید لکھنؤ کے محرم کو اتنی آفاقیت اور اتنا گلیمر کبھی نصیب نہ ہوتا۔ حالانکہ اس بات کے تاریخی حوالے نسبتاً کم ہیں کہ نواب واجد علی شاہ کے دور حکومت میں لکھنؤ کے محرم کے شاہی انتظام و اہتمام میں بتدریج اضافہ ہوا۔ لیکن اس بات کے پختہ ثبوت موجود ہیں کہ واجد علی شاہ نے لکھنؤ کی تعزیہ داری کو بلا تفریق مذہب و ملت عوام الناس سے قریب تر کر دیا۔

شاہی سرپرستی تو لکھنؤ کے محرم کو واجد علی شاہ سے پہلے بھی حاصل تھی لیکن واجد علی شاہ نے اسے دوبالا کر دیا اور لکھنؤ کے محرم کو عوامی تہوار بنا دیا جس میں جوش و خروش بھی تھا اور جس کے بہانے پورا اودھ ایک نئے رنگ میں رنگ جاتا تھا اور اگلے وقتوں میں یہی رنگ لکھنؤ کے محرم کا مخصوص رنگ بن گیا۔ لکھنؤ کے محرم کو حاصل رہی شاہی حکومتوں کی سرپرستی کا سلسلہ ہندوستان کی آزادی اور جمہوری نظام کے قائم ہونے میں بھی حائل نہ ہوا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے محرم کے انتظام و اہتمام میں برابر کی شریک رہتی ہے۔

> ہندوستان کے شمال مشرق کی سات ریاستوں کو 'ہفت عجائب' کہا جاتا ہے۔ وہاں کی طرزِ زندگی، زبان، تہذیب و تمدن اور سماجیات کے بارے میں واقفیت ہم لوگوں کو ذرا کم ہے۔
>
> ادارہ 'نیا دور' فخریہ طور پر یہ اعلان کر رہا ہے کہ انہیں ریاستوں میں سے ایک 'شیلانگ' میں رہنے والے ایک قبیلے کی 'کھاسی' زبان کی کہانیوں کو جلد شائع کرے گا۔ ان نمائندہ 'کھاسی' کہانیوں کا اردو ترجمہ معروف افسانہ نگار ف۔س۔اعجاز نے کیا ہے۔

لکھنؤ کے محرم کا ایک ادبی پہلو بھی ہے۔ بات انیسؔ و دبیرؔ سے شروع ہوئی تھی لیکن وہ ختم نہیں ہوئی ہے اور لکھنؤ نے مرثیے، نوحے اور سلام کے ہزار ہا ایسے شاعر اور خطیب پیدا کر دیے جنہیں پوری دنیا بطور خاص لکھنؤ کا ہونے یا لکھنؤ سے رشتہ ہونے کی وجہ سے محرم کے دنوں میں انہیں اپنے اپنے خطوں اور ملکوں میں مدعو کرتی ہے۔ اسے اردو ادب پر لکھنؤ کے محرم کا احسان کہا جائے گا کہ پورے اردو ادب کا تقریباً دسواں حصہ تو ضرور انہیں مرثیوں، نوحوں اور سلام پر مبنی ہے۔ اس میں ایسے ادب پارے بھی ہیں جنہیں کسی بھی عظیم ادبی شہ پارے سے زیادہ پذیرائی اور وقعت حاصل ہوئی۔ اردو کا شائد ہی کوئی ایسا معتبر شاعر ہو جس نے واقعۂ کربلا کو اپنی شاعری کا موضوع نہ بنایا ہو۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں جب بھی واقعۂ کربلا کا ذکر آتا ہے تو انیسؔ و دبیرؔ کسی نہ کسی طور پر، کسی نہ کسی حوالے کے روپ میں یا کسی نہ کسی عکس کی شکل میں ضرور موجود ہوتے ہیں۔

نیا دور کا اکتوبر کا شمارہ لکھنؤ کے محرم کے نام معنون کیا جا رہا ہے۔ شام غریباں، حسینیہ غفرانمآب، شاہی جلوس، سوا دو مہینے تک ہر مجلس پر تقسیم ہونے والا تبرک، بہتر تابوت، اماں باڑوں کی سجاوٹ، مہندی اور علم فاتح فرات جیسے رسومات صرف لکھنؤ کی ہی دین ہیں۔ یہی سب کچھ لکھنؤ کے محرم کی تہذیبی اور تمدنی ثقافت ہے جس کے پس پردہ ہمہ وقت کچھ مصرعے، کچھ اشعار و بند کے علاوہ افسانے بھی تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا میں شائد ہی کہیں اتنا طویل اور اتنا پرجوش کوئی اہتمام ہوتا ہو جس کا موضوع سوگ اور غم ہو۔ لکھنؤ اپنے محرم کے بغیر ادھورا ہے، لکھنؤ اپنی عزاداری اور نوحہ خوانی کے بغیر نامکمل ہے، لکھنؤ اپنی محرم کی شاہانہ لکھنوی روایتوں کے بغیر سانس نہیں لے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکتوبر کا پورا شمارہ لکھنؤ کے عزائی ادب سے انتساب ہے۔ اسی وجہ سے نیا دور کے مستقل کالم افسانے، غزلیں، کہانیاں غرض کہ سب کچھ نومبر کے شمارہ تک ملتوی کر دیا گیا ہے کہ ہم بھی سوگواران میں برابر کے شریک ہیں۔

سہیل وحید

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں! چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم! لب عیسیٰؑ پہ فغاں ہو
اے ماتمیان شہ معصوم! کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہ دیں کے ہے سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگۂ نُہ پایا جو مدّت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیرؑ سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم بیاں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو کہ رہبرِ راہِ وفا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایماں حسینؑ ابن علیؑ
کہ شمع انجمنِ کبریا کہیں اس کو

کفیلِ بخشش امّت ہے بَن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے کشتۂ تیغ جفا کہیں اس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانئے گر ہم برا کہیں اس کو

علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

جون ایلیاء

سلام

ذات محمد و علی اصل ہے ایک نام دو
میکدۂ وجود میں بادہ ہے ایک جام دو

پشت رسول پاک پر جلوہ نما امام دو
مرکب خوش خرام ایک راکب لالہ فام دو

نور جبین مصطفیٰ، ظلمت گیسوئے دوتا
جلوہ گہہ حرم میں آج، صبح ہے ایک شام دو

غار حرائے احمدی، خم غدیر حیدری
مقصد فیض عام ایک، منظر فیض عام دو

طور و جمال کبریا، دوش نبی و مرتضیٰ
اہل نظر سے پوچھئے، جلوہ ہے ایک بام دو

روئے علیؑ پہ اک نگہ جانِ نگاہ، دیں پناہ
اہل نظر نے لے لئے، ایک نظر سے کام دو

سرخیٔ عارض چمن، شوخیٔ غازۂ شفق
خوب لئے حسینؑ نے خونِ جگر سے کام دو

سید محمد حسن سالکؔ

سلام

کہا شبیر نے، تا حشر ظلم اے آسماں کوئی
اُٹھا رکھنا نہ اوروں کے لئے اب امتحاں کوئی

عبارت وہ، یہ تفسیریں، وہ صامت ہے، یہ ناطق ہیں
بجز آل نبیؐ کیا سمجھے قرآں کی زباں کوئی

علیؑ کا شیر تنہا ہے، ہے سناٹا سرِ ساحل
نہ لشکر ہے یہاں کوئی، نہ پہرا ہے وہاں کوئی

علی اکبرؑ تو اب رن میں فرس پر تھم نہیں سکتے
کہیں کس سے کہ بڑھ کر کھینچ لے دل سے سناں کوئی

زمین کربلا پر جب چھڑی جنگ حق و باطل کی
بجز قربانیٔ سرورؑ نہ آیا درمیاں کوئی

لُٹے ہیں جس طرح اہل حرم بعدِ شہِ والا،
نہیں لوٹا گیا ایسا جہاں میں کارواں کوئی

یہ نصرت اور یہ سن، ظلم گھبرا کر پکار اٹھا
علی اصغرؑ کی جرأت کا نہ دیکھا بے زباں کوئی

حقیقت ہے، سُنے ہیں واقعاتِ کربلا جب سے
بھلی لگتی نہیں کانوں کو غم کی داستاں کوئی

غمِ شبیرؑ نے اک بوند پانی کو یہ عزت دی
نہ لگ پائی جہاں سے قیمت اشکِ رواں کوئی

وہ لرزی کربلا سالکؔ دل شبیرؑ کی صورت
وہ تڑپا کھا کے پھل برچھی کا دل پر نوجواں کوئی

سید حسین تاج رضوی

سلام

خوں کے قطرات بنے بھیس بدل کر آنسو
شہر دل چھوڑ چلے، آنکھوں سے باہر آنسو

کبھی کر لیتے ہیں احباب کو بھی غم کا شریک
کبھی سینے میں بپا کرتے ہیں محشر آنسو

آمد ماہ محرم سے پس شامِ دہم
چشم خوں بار میں بدلا کئے تیور آنسو

حالت دل کے تغیر کا یہ دیکھا اعجاز
کبھی سیماب کبھی بن گئے گوہر آنسو

شب عاشور شہ دیں نے کیا گل جو چراغ
روشنی دینے لگے پلکوں پہ جل کر آنسو

حر بناتے ہیں اگر اشک ندامت بن جائیں
اور کر دیتے ہیں چہرے کو منور آنسو

صبح عاشور اذاں سن کے عجب حال ہوا
ابر کی طرح برستے رہے دن بھر آنسو

خشک نرمی سے پگھلتے ہوئے پتھر دیکھے
اک تبسم پہ بہاتے ہیں ستمگر آنسو

تاجؔ امروز ہے دل میں غم سرور کا پڑاؤ
اور آنکھوں میں ہیں ڈالے ہوئے لنگر آنسو

عفیف سراج

سلام

اے دشت بلا شاہِ مدینہ کے قدم سے
ملتی ہے تری آب و ہوا باغِ ارم سے

افلاک کشا خاک کے ذرات ہیں تیرے
کیا کام مجھے رہ گیا اب ساغر و جم سے

ہاں تشنہ لبی ہے تری مٹی میں ابھی تک
سیراب کروں آ میں تجھے دیدۂ نم سے

ہے جراتِ انکار کی بُو تیری فضا میں
تحریر شجاعت ہوئی شمشیر کے خم سے

خودکش ہے یزیدوں کے لئے سر کو اٹھانا
انکار کی تحریک ہے شبیر کے دم سے

حاکم بھی ہیں راضی بہ رضا بھی شہ والا
لکھا نہیں جاتا ہے فسانہ یہ قلم سے

ہے تشنہ لبی اب بھی وفاداری کے ہمراہ
لپٹی ہوئی ہے آج بھی اک مشک علم سے

وہ سنت شاہِ شہدا بھول گئے ہم
یہ ظلم گراں بار ہے کوفہ کے ستم سے

ہیں جاری ندامت میں سراجؔ آنکھوں سے آنسو
آقا کا سلام آ کے صبا کہہ گئی ہم سے

ہلالؔ نقوی

سلام

نصیب خاک شفا جب ہوئی جبینوں کو
پلٹ کے ہم نے نہ دیکھا فلک نشینوں کو

سجائے رہتے ہیں پلکوں پہ اشک ماتم شہ
چھپا کے ہم نہیں رکھتے کبھی خزینوں کو

کیا گداز دلوں کو اگائے درد کے پھول
غم حسین نمو دے گیا زمینوں کو

سیاہ رات میں حُر نے تلاش لی جنت
اداس کر دیا باطل کے دوربینوں کو

سلام کرتی ہیں اب تک فرات کی موجیں
سپاہ صبر ترے تشنہ کام سینوں کو

یہ معجزہ تھا صغیرِ حسین کو حاصل
ملا کے رکھ دیا صدیوں میں چھ مہینوں کو

ستم کے تیر پہ کیوں مسکرا دئے اصغر
اس اک سوال نے الجھا دیا لعینوں کو

سجے ہوئے تھے جو نیزوں پہ روز عاشورہ
تلاش آئینے کرتے ہیں ان حسینوں کو

مہیا بنت علیؑ نے کیا ہلالؔ یہاں
بہ شکل فرش عزا خلد کے سفینوں کو

سید عرفانؔ حیدر زنگی پوری

سلام

جنگ کرنے آئے تھے جو سیدِ ابرار سے
اصل میں تھا بغض اُن کو احمدِ مختار سے

سننے والوں کو لگا کوفہ میں گویا ہیں علیؑ
زینبِ دلگیر تیرے لہجۂ گفتار سے

سطوتِ شاہی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا
یوں صدا خطبے کی گونجی ظلم کے دربار سے

حُر کو سینے سے لگائے ہیں شہِ کرب و بلا
یا کہ ذرّہ متصل ہے پیکرِ انوار سے

کربلا سے شام تک لکھی ہیں خونیں آیتیں
ایک پابندِ سلاسل نے لہو کی دھار سے

کیا بھلا سمجھے گا کوئی صبر کے سایہ کا طول
قد بہت اُونچا ہے اُس کا ظلم کی دیوار سے

ہو نہیں سکتا جوابِ حسنِ اکبر دہر میں
یہ صدا دیتے ہیں یوسفؑ مصر کے بازار سے

کہہ رہی ہے مسجدوں سے یہ صدائے لا الٰہ
دین زندہ ہو گیا شبیر کے انکار سے

اصل میں عرفانؔ جو ہیں قاتلانِ کربلا
چبھ رہے ہیں ذہنِ انسانی میں اب بھی خار سے

کمیل شفیق رضوی

سلام

بریدہ بازو شکستہ انگشت، تیرا ماتم قریب آیا
سلگتی آنکھوں نوید تم کو لو موسم نم قریب آیا

رثائی آہٹ، جرس کی آواز میں ہے اگلے ہی موڑ پر
بیاض نوحہ اتارو محمل سے ناقۂ غم قریب آیا

وہ جن کے لوہو سوارِ دوشِ پیمبرانِ شفق ہوئے ہیں
تصور بے پناہ لے کر وہ لشکر کم قریب آیا

امامباڑوں کی روشنی میں غریب خانوں کے زخم بھرنے
عقیدتوں میں علم کے پنجوں سے طشت مرہم قریب آیا

عطش کے سورج کی دھوپ نکلی ہوائے صحرا بھی چل پڑی ہے
پلک کی شاخوں پہ جس سے آتے ہیں پھل وہ موسم قریب آیا

گلوئے فرزند پر چھری کا نشاں یہ کہتا ہے ہاجرہ سے
نشانِ نہر فرات لے کر ولیٔ زمزم قریب آیا

ہمارے بچوں کو چاہتے تھے، غزال آپس میں کہہ رہے تھے
بہ سوئے ذکر حسینؑ دوڑو کہ لمحۂ رم قریب آیا

برہنہ لاشوں کی یادِ تازہ سیاہ پردوں سے بڑھ رہی ہے
چراغ اندھیرے میں رو رہے ہیں مہ محرم قریب آیا

غلاف پر کربلا کے مصرعے کمیلؔ دل میں اتر گئے ہیں
وہ سوزخوانی کا ایک تکیہ نظر سے جس دم قریب آیا

قائم مہدی تذہیبؔ نگروری

سلام

کربلا تیرا اثر شام و سحر دیکھتے ہیں
تیرے ماحول میں معراجِ بشر دیکھتے ہیں

زندگی تجھ سے وسیع النظری پاتی ہے
تجھ کو حیرت سے سبھی اہل نظر دیکھتے ہیں

قسمت حرؑ کی سحر دیتی ہے دعوت اب بھی
متلاشیٔ سحر جانے کدھر دیکھتے ہیں

شمع گل کرتے ہیں شبیرؑ تو سب پروانے
رات بھر مطلع انوارِ سحر دیکھتے ہیں

سب کے سب ایک نظر، ایک زباں، ایک خیال
ابن زہراؑ! ترا اعجازِ نظر دیکھتے ہیں

نوکِ نیزہ سے تلاوت کی صدا گونجی ہے
اہلِ افلاک قد نوع بشر دیکھتے ہیں

خوں بھری میّت ہم شکل نبیؐ خاک پہ ہے
نگہِ یاس سے شہؑ روئے پسر دیکھتے ہیں

خلد کی فکر میں ہیں آلِ پیمبرؐ کے عدو
شام کے اہل ہیں، اور خوابِ سحر دیکھتے ہیں

دولت مقصد شبیرؑ ہے جانِ تذہیبؔ
لوگ حیرت سے مرا زادِ سفر دیکھتے ہیں

آل عبا

سلام

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا
غریب دیتے ہیں پرسہ تمہارے پیاروں کا

سلام ان پہ جنہیں شرم کھائے جاتی ہے
کھلے سروں پہ اسیری کی خاک آتی ہے

سلام اس پر جو زحمت کش سلاسل ہے
مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے

سلام دیتے ہیں ہم اپنی شاہزادی پر
تھے جن کو سونپ گئے مرتے وقت گھر سرور

مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھلائی
نثار کر دیئے بچے نہ بچ سکا بھائی

اسیر ہو کے جسے شامیوں کے نرغے میں
حسینیت ہے سکھانا علی کے لہجے میں

سکینہ بی بی تمہارے غلام حاضر ہیں
بجھے جو پیاس تو اشکوں کے جام حاضر ہیں

یہ سن ، یہ حشر، یہ صدمے نئے نئے بی بی
کہاں پہ بیٹھی ہو خیمے تو جل گئے بی بی

پہاڑ رات بڑی دیر ہے سویرے میں
کہاں ہو شام غریباں کے گھپ اندھیرے میں

زمین گرم یتیمی کی سختیاں بی بی
وہ سینہ جس پہ کہ سوتی تھیں اب کہاں بی بی

جناب مادر بے شیر کو بھی سب کا سلام
عجیب وقت ہے کیا دیں تسلیوں کا پیام

ابھی کلیجے میں اک آگ سی لگی ہو گی
ابھی تو گود کی گرمی نہ کم ہوئی ہو گی

نہیں اندھیرے میں کچھ سوجھتا کہاں ڈھونڈیں
تمہارا چاند کہاں چھپ گیا کہاں ڈھونڈیں

نہ اس طرح کوئی ہستی ہری بھری اجڑی
تمہاری مانگ بھی اجڑی ہے گود بھی اجڑی

نہیں لعینوں میں انساں کوئی خدا حافظ
درندے اور یہ بے وارثی خدا حافظ

سلام محسن اسلام خستہ تن لاشو
سلام تم پہ شہیدوں کے بے کفن لاشو

سلام تم پہ رسول و بتول کے پیارو
سلام مہر امامت کے گرد سیارو

بچے تو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم پھر ہے
جو چل بسے تو یہ اپنا سلام آخر ہے

شاہی زمانے میں
لکھنؤ کی عزاداری کی ایک جھلک

سید مسعود حسن رضوی ادیب
۱۸۹۳ ۱۹۷۵

اودھ کے فرمانرواؤں سے لے کر عوام تک محرم کی عزاداری میں انتہائی انہماک رکھتے تھے ۔ اودھ کے بادشاہوں کا کیا ذکر یہاں ایسی بیگمات اور امراء ہمیشہ موجود رہے جو مراسم عزا کی بجا آوری میں لاکھوں روپئے صرف کرتے تھے۔انھوں نے بڑے بڑے شاندار امام باڑے اور کربلائیں تعمیر کیں ۔ آصف الدولہ کے امام باڑے کی عظیم الشان عمارت فن تعمیر کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔غازی الدین حیدر کا امام باڑہ،شاہ نجف اور محمد علی شاہ کا امام باڑہ، حسین آباد آج تک زیارت گاہ خلق ہیں ۔ مجالس عزا جس شان سے ہوتی تھیں اور جلوس عزا جتنی دھوم سے نکلتے تھے اس کے تفصیلی بیان کی تو گنجائش نہیں۔اس کا کچھ تصور پیدا کرنے کے لئے غازی الدین حیدر کے خاص محل بادشاہ بیگم کے یہاں کی عزاداری کا مرقع خسروی کے مصنف عظمت علی نامی کا کوروی کی زبان سے سنئے ۔

''جناب بادشاہ بیگم صاحب کے یہاں عشرہ محرم چہلم تک وہ خیر و فیر کہ حرس محتاج تک سیر، کھانے اقسام اقسام کے نہایت تحفہ اس کثرت سے کہ کھائے نہ جاتے، روپئے اشرفی اتنے بٹتے کہ اٹھائے نہ جاتے ، جوڑ شیر مال کا اڑھائی سیرا۔طباق پلاؤ کا چوسیرا، قفلیاں سالن کی فی حصہ دو، میٹھا قند کا غالب کہ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہو۔شیر برنج و ماقوتی کے دو دو خوانچے ، دو سیر قفلیاں، دہی ملائی کی ۔اس سے بڑھ کر یہ ایک حصہ کہ چار سے اٹھائے نہ اٹھتا، سو دن رات بے گنتی بے مزاحمت غرباء مساکین اور اہل مجلس کو ملتا۔آٹھ سات سبیلیں جا بجا بے مثل جن میں صرف قند اور دودھ کی ریل پیل سر راہ رکھی جائیں، لوگ اس قدر پیتے کہ حرصیں بھر جاتیں، مرثیہ خوانوں کتاب خوانوں کی گنتی نہ تھی ۔خلعت اور انعام دینے سے سیری نہ ہوتی تھی ۔ باقی اور سب طرح کے لوازمے عزاداری کے اس نفاست اور کثرت سے کہ کیا کہئے دیکھنے والوں کو یقین کی جا ہے اور سننے والوں کے

''قیاس سے باہر، سچ مچ نہال خوش نیتی کا ثمر، جس کو طلسم حیرت افزا کہئے ۔ یا سراسر تصرف افضال جناب سید الشہداء سمجھئے حال اور حقیقت ، بخشو اور خدایار خاں کی ہے۔۔۔ یہ دونوں ہمدم شخص ۔۔۔ پیشہ آرائش سازی کا کرتے ۔۔۔عشرۂ محرم میں تعزیہ رکھتے اور ۲۶ صفر کو پیشتر سے بہت سی دیگیں اور سالن تلی ہوئی ترکاری کی تیار ہوتیں اور اس میں سے ایک طباق بڑا بھرا ہوا اور ایک ایک قفلی ، اس کے موافق کی اور دو دو خمیری روٹیاں ۔ ہزار ہا آدمی مجلسی کو بٹتیں ۔ اور علاوہ اس کے سترہ اٹھارہ علم ۔ جناب عباس علیہ السلام کے فلک فرسا ہوتے ، ان کے پیچھے غول کے غول ۔ چار چار پانچ آدمی برہنہ سر، ماتم کناں، سینہ زناں، ساتھ ہوتے۔

نزدیک مبالغہ ہے۔خلاصہ یہ کہ امام کے نام پر چالیس دن ایسا مال، کھانا لٹاتیں کہ محتاجوں کی نیتیں بھر جاتیں۔

یہ تو امیروں کے یہاں کی مجلسوں کا نمونہ تھا۔ اب غریبوں کے یہاں کے جلوسوں کا نمونہ دیکھئے وہی مصنف اپنی اسی کتاب میں رقم طراز ہے۔

''قیاس سے باہر، سچ مچ نہال خوش نیتی کا ثمر، جس کو طلسم حیرت افزا کہئے ۔ یا سراسر تصرف افضال جناب سید الشہداء سمجھئے حال اور حقیقت، بخشو اور خدایار خاں کی ہے۔۔۔ یہ دونوں ہمدم شخص ۔۔۔ پیشہ آرائش سازی کا کرتے ۔۔۔عشرۂ محرم میں تعزیہ رکھتے اور ۲۶ صفر کو پیشتر سے بہت سی دیگیں اور سالن تلی ہوئی ترکاری کی تیار ہوتیں اور اس میں سے ایک طباق بڑا بھرا ہوا اور ایک ایک قفلی، اس کے موافق کی اور دو دو خمیری روٹیاں، ہزار ہا آدمی مجلسی کو بٹتیں ۔ اور علاوہ اس کے سترہ اٹھارہ علم ۔ جناب عباس علیہ السلام کے فلک فرسا ہوتے، ان کے پیچھے غول کے غول ۔ چار چار پانچ آدمی برہنہ سر، ماتم کناں، سینہ زناں، ساتھ ہوتے۔ چار چار پانچ آدمی برہنہ سر، ماتم کناں، سینہ زناں، ساتھ ہوتے۔ سوان کے لئے رنگین پلاؤ، سالن کی مسلم ہر مقام پر مجمعوں کے پہنچائی جاتیاں، اور وہاں ان کے طور پر تقسیم ہوتیاں ، باقی اور سب لوازمے اس کے حقے، تمباکو، گوٹا، افیون، کوپلے وغیرہ بے پرستش ، بے انتہا ، ہر شخص کے لائق وفائق ، آگے مزدور اور سقے اور کہاروں کی گنتی نہیں ۔ کثرت ہر قسم کے جلوس وضروریات کی قیاس میں آتی نہیں۔ہاتھی، سانڈنیا پلٹنیں ، سوار، چوب دار، بلم بردار، جھنڈی والے۔کل امرائے شہر اور شہر یاری کی سرکار سے آتے ۔ سب اعلیٰ قدر حال وقت رخصت انعام اور کرائے والے کرایہ پاتے ۔ اکثر عمائد بلکہ خود بادشاہ مستدعی رہے کہ کسی قدر یہ ہم سے لے۔لیکن کسی سے ایک جے لینا کسی طرح قبول نہ کیا۔الحاصل یہ وضع قطع درحقیقت ایک کہانی ہے، بیشک برکات اور عجائبات کی نشانی ہے، ورنہ کیا بساط ان غریب مزدوری پیشہ کی۔

□□□

مجلس شام غریباں

مولانا سید کلب جواد نقوی
۳۹ جوہری محلہ، لکھنؤ
موبائل: 9415021548

ہر غم چاہے کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی شدت میں کمی ہوجاتی ہے۔ ایک ماں کا اکلوتا جوان بیٹا کیوں نہ مر گیا ہو لیکن رفتہ رفتہ غم کم ہوتا جاتا ہے۔ اس میں انسان کا کوئی قصور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مصلحت کے تقاضوں کے تحت انساں کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کیونکہ جتنا غم پہلے دن ہے اگر سال در سال بعد تک غم کی وہی شدت رہے تو سارا کاروبار زندگی معطل ہو جائے اور انسان کسی کام کے لائق نہ رہے۔ مگر صرف ایک غم ایسا ہے جو انسان کی اس فطرت پر غالب ہے اور وہ ہے کربلا کے شہیدوں کا غم۔ یہاں معاملہ برعکس ہے زمانہ کے ساتھ غم گھٹتا جاتا ہے لیکن یہ وہ غم ہے جو زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے، پھیل رہا ہے، ہمہ گیر ہو رہا ہے۔ کربلا کا واقعہ زمانے کی حد بندیوں میں محدود نہیں ہے نہ ہی کسی خاص فرقے سے مخصوص ہے۔ بلکہ جس انسان میں تھوڑی سی بھی انسانیت پائی جاتی ہے وہ کربلا کے واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی مذہب، خطہ زمیں یا کسی بھی زمانے کا انسان ہو اس کو اپنی ضمیر کی پکار کا جواب کربلا میں مل جائے گا۔ کسی شاعر نے بہت اچھا شعر کہا ہے:

یہ ہم نے کب کہا کہ ہماری ہے کربلا
حق بات تم کہو تو تمہاری ہے کربلا

اور بہت اچھی بات کہی گئی ہے کہ اگرچہ امام حسین عرب کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانِ بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ خانوادۂ رسالت کے ایک فرد تھے اور دین اسلام کے نمائندے تھے۔ مگر جس طرح سورج نکلتا مشرق سے ہے مگر ساری دنیا کو روشنی دیتا ہے۔ بادل ابھرتے سمندر سے ہیں مگر ہر کھیت پر برستے ہیں۔ پھول کی خوشبو کسی مذہب یا فرقہ کی تفریق نہیں کرتی۔ گلاب کا پھول کھلتا ہے کسی ایک گھر میں مگر سارے

کہاں ہندوستان اور کہاں ہزاروں میل دور سرزمین کربلا۔ لیکن برصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں غم امام حسین مختلف مذاہب اور فرقے نہ مناتے ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عزاداری امام حسینؑ کے معاملے میں پورے ہندوستان میں سرزمین اودھ کو خصوصی اہمیت اور پورے اودھ میں شہر لکھنؤ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ سچائی بھی ناقابل انکار ہے کہ اودھ کے بادشاہوں کو عزائے امام حسین کی طرف توجہ دلانے میں مجدد شریعت جناب سید دلدار علی غفرانمآب اور اوران کے خانوادہ کا بنیادی کردار ہے۔ بہت سے مراسم جناب غفرآنماب نے عزا میں شامل کئے جن کی پیروی آج تک پورے برصغیر میں ہو رہی ہے۔

علاقے کو معطر کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے غم کربلا اور پیغام کربلا بھی آفاقی ہے کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں ہے۔ نہ زمان و مکان کی حد بندیوں میں محدود ہے۔

کہاں ہندوستان اور کہاں ہزاروں میل دور سرزمین کربلا۔ لیکن برصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں غم امام حسین مختلف مذاہب اور فرقے نہ مناتے ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عزاداری امام حسینؑ کے معاملے میں پورے ہندوستان میں سرزمین اودھ کو خصوصی اہمیت اور پورے اودھ میں شہر لکھنؤ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ سچائی بھی ناقابل انکار ہے کہ اودھ کے بادشاہوں کو عزائے امام حسین کی طرف توجہ دلانے میں مجدد شریعت جناب سید دلدار علی غفرانمآب اور اوران کے خانوادہ کا بنیادی کردار ہے۔ بہت سے مراسم جناب غفرآنماب نے عزا میں شامل کئے جن کی پیروی آج تک پورے برصغیر میں ہو رہی ہے۔ جناب غفران مآبؒ کا بنا کردہ امام باڑہ ''حسینہ غفران مآبؒ'' کے نام سے ساری دنیا میں معروف ہے اور یہاں کا عشرۂ محرم بہت قدیم اور مجمع کے لحاظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عشرۂ محرم کی آخری مجلس کا نام مجلس شام غریباں ہے جو دس محرم کا دن گزار کر شب میں منعقد ہوتی ہے یہ مجلس اتنی مقبول ہوتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان بلکہ جہاں جہاں اُردو داں طبقہ پوری دنیا میں موجود ہے وہاں مجلس شام غریباں کے نام سے مجلس ضرور منعقد ہوتی ہے۔ اس مجلس کی ابتداء کے سلسلہ میں بزرگوں کے بیانات اور ہمارے بزرگ خاندان جناب منّے آغا صاحب رازؔ اجتہادی کے ایک مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے۔

''اس اہم اور اثر انگیز مجلس کی ابتدا لکھنؤ میں بالکل اچانک اس طرح ہوئی کہ ۱۹۲۶ء میں ابن سعود کے مظالم سے تنگ آکر مدینہ منورہ کے رہنے والے دو عرب جن میں سے ایک کا نام سید صالح تھا (دوسرے کا

نام یاد نہیں آ رہا ہے) ۲ رمحرم کو لکھنؤ آئے۔ امامباڑہ غفران مآب کی مجلس میں شرکت کرنے کے بعد ان دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ لکھنؤ میں ان کا کوئی واقف کار نہیں ہے۔ امامباڑے کے ہی حجرہ میں ان دونوں کے قیام وطعام کا انتظام کیا گیا۔ عشرہ محرم کو میری اور سرکار عمدۃ العلماء کی یہ رائے ہوئی کہ ان دونوں مہمانوں کے ساتھ ہی امامباڑہ میں فاقہ شکنی کی جائے۔ مکان سے فاقہ شکنی کا سامان اور سماور وغیرہ منگا لیا گیا۔ فاقہ شکنی کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ برادر مرحوم انتخاب العلماء مولانا سید سبط محمد ہادی عرف کلن صاحب قبلہ، برادر عزیز سید محمد رضی اجتہادی مرحوم، سید شجاع حسین عرف شجن صاحب مرحوم بھی شریک فاقہ شکنی تھے۔ اچانک سید صالح (عرب) نے کہا کہ اس وقت دیگر باتوں کے بجائے اگر ذکر مصائب ہوتو بہتر ہے سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ سید کاظم حسین (نگران امامباڑہ) کو بھیجا گیا کہ سادی چائے کا کچھ اور انتظام کرلیں اور مومنین کو اطلاع کردیں۔ تقریباً ستّر، اسّی حضرات جمع ہوگئے۔ انتخاب العلماء نے بہت کامیاب ذاکری فرمائی۔ عمدۃ العلماء نے مجلس کے بعد فرمایا مناسب ہے کہ یہ مجلس جس کی ابتدا اب کی ہوئی ہے ہر سال ہوا کرے مولوی سید رضی ہدفؔ اجتہادی صاحب مرحوم کی تجویز ہوئی کہ اس مجلس میں فرش اور شمگیرے وغیرہ کا کچھ انتظام نہ ہوا کرے۔ میرے منھ سے بے ساختہ نکلا کہ اس کا نام ''شام غریباں'' قرار دیا جائے۔ دوسرے سال باقاعدہ اعلان کے بعد مجلس منعقد کی گئی۔ اور خلاف امید اتنا مجمع ہوا کہ تقریباً نصف صحن بھر گیا۔ سرکار عمدۃ العلماء کا بیان اتنا اثر انگیز تھا کہ کئی آدمیوں کو غش آگیا۔ چونکہ قاعدہ ہے کہ کسی کے انتقال کے بعد دوستوں کی طرف سے سوگواروں کو کڑوی روٹی کے نام سے کھانا بھیجا جاتا ہے۔ اور یہ بھی شہرت ہے کہ زوجہ حُر اہل حرم کے لئے کھانا اور پانی لائی تھی۔ لہٰذا تیسرے سال یہ طے ہوا کہ شبیہوں کے بجائے کچھ خوان اور مشکیں مجلس کے بعد لائی جائیں اور کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں شمعیں روشن ہوں اس مظاہرے سے اثر انگیزی میں اور اضافہ ہوگیا۔

یہ مجلس سال بہ سال ترقی کرتی چلی گئی اور بعض مومنین پر اتنا شدید گریہ طاری ہوتا تھا اور اس طرح غش آتا تھا کہ میڈیکل کالج لے جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا مولوی علی حسین صاحب مرحوم کی تحریک پر وکٹوریہ گنج اسپتال کے انچارج ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب مرحوم دو کمپونڈروں اور دواؤں کے ساتھ آنے لگے۔ بکثرت

> یہ مجلس خطابت اور ادبیت کے اعتبار سے بھی ایک یادگار مجلس تھی۔ جس میں مرحوم نے چمکتے ہوئے چاند کو خطاب کرکے اس کی زبانی پوری تاریخ کربلا دہرائی تھی۔ جو کتابی صورت میں طبع ہوکر ہزاروں مومنین کے پاس بطور یادگار اب بھی موجود ہے۔ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی ایسا جریدہ ہو جس میں مرحوم کے انتقال کے بعد یہ مجلس طبع نہ ہوئی ہو۔ جناب عمدۃ العلماء کی حیات ہی میں اس مجلس کی مقبولیت کو دیکھ کر ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ داروں نے اس کا وقت بڑھا کر ۳۰ منٹ کردیا اور بعض مجبوریوں کی بنا پر اس کے نشر کا وقت ۱۰ بجے کر چالیس منٹ کردیا میرے خیال میں تبدیلی وقت سے ان لاکھوں عزاداروں کو اور مجلس کے مشتاقوں کو بڑی زحمت پڑتی ہے۔

بے ہوش ہوجانے والوں کو اٹھانے کے لئے شعبۂ اسکاؤٹس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ مجمع کی کثرت سے امام باڑہ غفران مآب کا وسیع صحن تنگ داماں ہوگیا۔

شاید ۳۰ یا ۳۱ عیسوی میں جناب مہاراجکمار محمود حسن خان صاحب آف اقبال منزل اور حسینی شاعر فضلؔ صاحب نقوی کی تحریک سے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے اس مجلس کو براڈ کاسٹ کرنا شروع کیا۔ ابتداء میں کل ستّرہ منٹ دیئے گئے تھے جس میں پندرہ منٹ مجلس اور دو منٹ ماتم نشر کیا جاتا تھا۔ سرکار عمدۃ العلماءؒ کی خطابت اور قادر الکلامی کا یہ اعجاز تھا کہ جیسے ہی ایک چھوٹے سے بلب کے روشن ہونے سے براڈ کاسٹنگ کا اشارہ ہوتا تھا، آپ بغیر اس کے کہ مجمع کو ذرا سا بھی احساس ہوا اپنے بیان کا رُخ موڑ دیتے تھے۔ اور وہ انداز بیان اختیار فرمالیتے تھے جو بین الاقوامی نوعیت کا ہو۔ اور ہر مسلم اور غیر مسلم کے سننے کے لائق ہو۔ اور اس پندرہ منٹ میں نہ صرف معرکۂ کربلا کی تاریخ اور مقاصد جنگ بلکہ مقصد اسلام، رسولؐ اسلام کے انداز تبلیغ، اہلبیتؑ کی سیرت، مصائب کربلا سب کچھ ہی سمیٹ لیتے تھے کوزے میں نہیں بلکہ گویا قطرے میں سمندر سمودیتے تھے۔ اس مجلس کا انداز دیگر مجالس سے ہمیشہ امتیازی اور جداگانہ رہا ہے۔ فضائل بھی ہوں، تذکرہ اہلبیتؑ بھی ہو، نکات بھی بیان کئے جائیں مگر انداز بیان ایسا رہے کہ سوگواری کا اثر قائم رہے۔ درود وصلوٰۃ اور تعریف کے ہمہموں سے یہ تاثر ختم نہ ہونے پائے۔

مجلس کے براڈ کاسٹنگ ہونے کے بعد سے تو یہ ایک مجلس ہزاروں جگہ ہونے لگی۔ عزاخانوں میں یہ انتظام کیا گیا کہ اس مجلس کے وقت کے قریب روشنیاں گل کردی جائیں۔ فرش ہٹا دیا جائے اور بجائے ذاکر کے ریڈیو رکھ دیا جائے۔ لطف یہ کہ ہر جگہ وہی اثر انگیزی قائم رہتی ہے جو خود امام باڑہ میں سامعین پر ہوتی ہے۔

جناب عمدۃ العلماء نے اپنی حیات کے آخری دور تک اس مجلس کو نباہا۔ جناب مرحوم نے سب سے پہلی مجلس اسی امامباڑہ میں پڑھ کر اپنی ذاکری کی ابتدا کی تھی اور اپنی زندگی کے آخری محرم ۱۹۶۳ء میں دہم محرم کو عصر کے وقت آخری مجلس بھی اسی امامباڑے میں یوں پڑھی کہ فینس پر تشریف لے گئے کئی آدمیوں نے سنبھال کر منبر پر بٹھایا۔ اور بیس منٹ اس ضعف ونقاہت کے عالم میں مجلس پڑھی جب کہ کسی دوسرے کے لئے بات کرنا بھی مشکل ہوتا۔ اسی سال کی شام غریباں کی مجلس وہ آخری مجلس تھی جس کا مسودہ مرحوم نے تحریر فرمایا تھا خود تو نہ پڑھ سکے مگر مولانا کلب صادق صاحب سلمہٗ ایم۔اے۔ نے بالکل مرحوم ہی کے لب ولہجہ میں اس

طرح بیان کیا کہ باہر کے سننے والوں کو یہ اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ سرکار مرحوم خود نہیں پڑھ رہے ہیں۔ یہ مجلس خطابت اور ادبیت کے اعتبار سے بھی ایک یادگار مجلس تھی۔ جس میں مرحوم نے چمکتے ہوئے چاند کو خطاب کرکے اس کی زبانی پوری تاریخ کربلا دہرائی تھی۔ جو کتابی صورت میں طبع ہوکر ہزاروں مومنین کے پاس بطور یادگار اب بھی موجود ہے۔ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی ایسا جریدہ ہو جس میں مرحوم کے انتقال کے بعد یہ مجلس طبع نہ ہوئی ہو۔ جناب عمدۃ العلماء کی حیات ہی میں اس مجلس کی مقبولیت کو دیکھ کر ریڈیو اسٹیشن کے ذمہ داروں نے اس کا وقت بڑھا کر ۳۰ منٹ کردیا اور بعض مجبوریوں کی بنا پر اس کے نشر کا وقت ۱۰ بج کر چالیس منٹ کردیا میرے خیال میں تبدیلی وقت سے ان لاکھوں عزاداروں کو اور مجلس کے مشتاقوں کو بڑی زحمت پڑتی ہے جو شب عاشور بیدار رہنے کے بعد دن بھر مجلس وماتم میں مشغول رہتے ہیں۔ اور فاقہ شکنی کے بعد تھک کر چور ہوتے ہیں۔

میں بہت مایوس تھا کہ جناب مرحوم کے بعد امام باڑہ غفران مآبؒ کے عشرے اور خاص طور پر شام غریباں کی مجلس کا کیا ہوگا جو اپنے رنگ کی منفرد مجلس ہے مگر جناب مرحوم کے مرض الموت میں عزیزی مولوی سید کلب صادق صاحب سلمہٗ نے بڑی خوبی سے مجلسوں کی سابقہ روایات کو قائم رکھا اور ان کے انتقال کے بعد عزیزم صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب سلمہٗ نے اپنے پدر مرحوم کے قدم بہ قدم چل کر مجالس حسینیۂ غفران مآبؒ کو جن کے دم سے لکھنؤ کی عزاداری کی رونق ہے چار چاند لگادیئے۔ یہ تو نہ کہوں گا کہ صفوۃ العلماء کا طرز خطابت اپنے پدر بزرگوار سے بہتر ہوتا ہے مگر اس کہنے میں کوئی تکلف نہ کروں گا کہ اب اجتماع پہلے زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اور میں تو اس کو بھی جناب مرحوم کے ایثار اور روحانی برکتوں اور حضرت غفران مآبؒ کے خلوص نیت کا فیض سمجھتا ہوں۔ اب تو یہ مجلس دس بج کر ۴۰ منٹ پر لکھنؤ سے براڈ کاسٹ ہوتی ہے اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے علاوہ دہلی، کشمیر اور بعض دیگر اسٹیشن بھی اس کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچاتے ہیں۔ مجلس شام غریباں کا لکھنؤ سے اتنا گہرا تعلق ہوگیا ہے کہ تھوڑے ہی دن پہلے لکھنؤ پر (اردو مجلس میں) جب ایک فیچر نشر کیا گیا تو اس میں خاص طور پر اس مجلس کا ذکر کیا گیا اور اس کا ایک حصہ بھی نشر کیا گیا۔ اب مجمع کا یہ عالم ہوتا ہے کہ امام باڑہ کے طویل وعریض صحن کے علاوہ منڈی کی پوری سڑک (جس کا لکھنؤ کارپوریشن نے حال ہی میں مولانا کلب حسین مارگ نام تجویز کیا ہے) آغا باقر مرحوم کا امامباڑہ جنّت کی کھڑکی کا صحن اور سلطان المدارس کے پہلو سے گذرنے والی سڑک مجمع سے مملو نظر آتی ہے۔ بعض لوگ پہلے ہی جگہ لینے کے لئے آجاتے ہیں اور فاقہ شکنی بھی (جس کا انتظام پہلے عمدۃ العلماء اور اب صفوۃ العلماء کی طرف سے عصر عاشور کی مجلس کے بعد کیا جاتا ہے) کرکے یہیں ٹھہر جاتے ہیں نہ صرف مومنین اور دیگر برادران اسلامی شرکت کرتے ہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی دلچسپی سے شرکت کرتے ہیں۔ بیرون ملک سے آئے ہوئے سیاح بھی اس منظر کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ دوسال سے یو۔پی۔ کے ہردل عزیز گورنر جناب بی۔ گوپالا ریڈی صاحب بھی شریک ہوتے ہیں اور کافی متاثر ہوتے ہیں۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے مدراسی ڈائرکٹر صاحب نے شرکت فرمائی اور کہا ''کوئی ریلیجس پروگرام کسی بھی فرقہ کا اتنا مقبول نہیں ہے جو اس مجلس کو مقبولیت حاصل ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ جس ہوٹل یا دوکان کے ریڈیو سے یہ مجلس نشر ہوتی ہے وہاں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں'' گورنر صاحب غیر مسلم حضرات اور سیاح حضرات کے لئے علاحدہ ہال میں انتظام ہوتا ہے تاکہ مجمع کی کثرت کی بنا پر زیارت سے محروم نہ ہوجائیں اور مجلس کے بعد ان حضرات کی چائے وغیرہ سے ضیافت کی جاتی ہے۔

(رازِ اجتہادی عفی عنہ، مارچ ۱۹۷۲ء)

پدر بزرگوار کی رحلت کے بعد سے عشرہ کے علاوہ مجلس شام غریباں میں بھی بندہ ہی کا بیان ہوتا ہے جس پر حقیر کی طرف سے کوئی تبصرہ مناسب نہیں ہے بس اس شعر پر بات کو تمام کرتا ہوں کہ:

زمانہ تجھ سے سبق لے گا حشر کے دن تک
حسین ابن علی تیرے غم کی عمر دراز

❑❑❑

جناب عمدۃ العلماء نے اپنی حیات کے آخری دور تک اس مجلس کو نباہا۔ جناب مرحوم نے سب سے پہلی مجلس اسی امامباڑہ میں پڑھ کر اپنی ذاکری کی ابتدا کی تھی اور اپنی زندگی کے آخری محرم ۱۹۶۳ء میں دہم محرم کو عصر کے وقت آخری مجلس بھی اسی امامباڑے میں یوں پڑھی کہ فینس پر تشریف لے گئے کئی آدمیوں نے سنبھال کر منبر پر بٹھایا۔ اور بیس منٹ اس ضعف ونقاہت کے عالم میں مجلس پڑھی جب کہ کسی دوسرے کے لئے بات کرنا بھی مشکل ہوتا۔ اسی سال کی شام غریباں کی مجلس وہ آخری مجلس تھی جس کا مسودہ مرحوم نے تحریر فرمایا تھا خود تو نہ پڑھ سکے مگر مولانا کلب صادق صاحب سلمہٗ ایم۔اے۔ نے بالکل مرحوم ہی کے لب ولہجہ میں اس طرح بیان کیا کہ باہر کے سننے والوں کو یہ اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ سرکار مرحوم خود نہیں پڑھ رہے ہیں۔ یہ مجلس خطابت اور ادبیت کے اعتبار سے بھی ایک یادگار مجلس تھی۔ جس میں مرحوم نے چمکتے ہوئے چاند کو خطاب کرکے اس کی زبانی پوری تاریخ کربلا دہرائی تھی۔ جو کتابی صورت میں طبع ہوکر ہزاروں مومنین کے پاس بطور یادگار اب بھی موجود ہے۔ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی ایسا جریدہ ہو جس میں مرحوم کے انتقال کے بعد یہ مجلس طبع نہ ہوئی ہو۔

مرثیہ اور سوز خوانی کا فن

مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ

اس برصغیر میں عزاداری نے معنوی اعتبار سے صرف ترقی ہی نہیں کی بلکہ اس سرزمین نے عزاداری کو اپنالیا اس میں ابتداً تو انداز بیان تقلیدی رہا۔ لیکن بعد میں تقلید میں بھی ترمیم کی گئی، وہ صنف بالکل ہی جدا ہوگئی۔

کہتے ہیں کہ مرثیہ کا آغاز شہادت ہابیل اور مرثیہ حضرت آدم سے ہوا۔ اور مرثیہ گوئی کا پہلا شرف زبان سُریانی کو حاصل ہوا ہے۔ یعرب بن قحطان نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔

اس بیان سے کم از کم مرثیہ کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ مطابقت بھی تعجب خیز ہے کہ سریانی کے بعد دوسری زبان جس کا آغاز مرثیہ سے ہوتا ہے وہ ہماری اردو ہے اور عرب کے بادشاہ یعرب بن قحطان کی جگہ دکن کے بادشاہ قطب شاہ اس کے موجد ہیں۔

ملک میں مدتوں یہ خیال چکّر لگاتا رہا ہے کہ اکبر کے اُردوئے معلّیٰ (چھاؤنی) کے مختلف الالسنہ سپاہیوں کے میل جول نے اردو کی تازہ زبان پیدا کی، جو اپنے تفہیم وافہام میں سب کے لئے یکسانیت رکھتی ہے۔ مگر ہم کو حیرت ہوتی ہے جب ہم گذشتہ دو عظیم الشان لڑائیوں میں مغرب ومشرق جنوب وشمال کے ہر ملک او رہر زبان بولنے والوں کو یکجا دیکھتے ہیں، اور یہ مختلف زبانیں بولنے والے پانچ پانچ چھ چھ برس تک یکجا رہنے اور آپس میں اظہار مطلب کرنے پر مجبور بھی ہوتے ہیں، مگر کسی نئی زبان کی ایجاد نہیں ہوتی۔

ہاں مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جواَن پڑھ ہندوستانی یہاں سے جاتے ہیں، وہ انگریزی کے مجروح ٹوٹے پھوٹے الفاظ یاد کر کے واپس ہوتے ہیں۔

ہم کو اردو کی ابتداء کے بعد اس کے ارتقائی نقطہ پر پہنچنے میں بھی غزل یا مثنوی یا قصیدے یا اور کوئی صنف ایسی نظر نہیں آتی جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں

میر تقی میرؔ، مرزا سوداؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، اسیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور وزیرؔ، صباؔ، رندؔ نظیرا کبرآبادی۔ یہ سب شیعہ تھے، اور ہر شیعہ غزل گو نے مرثیہ یا نوحہ ضرور کہا ہے۔

سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے کلیات ملاحظہ ہوں، اس طرح اردو کا وسطی دَور بھی مرثیے سے لبریز نظر آئے گا۔ غالبؔ مرحوم منصف مزاج تھے، انھوں نے میر انیسؔ کے مقابل اپنی شکست کو ضمیر کی فتح سمجھ کر، چند بند کہہ کر پھاڑ ڈالے مگر مرثیہ ضرور کہا۔ اس طرح زبان اردو کا ہر دور مرثیے کے لئے باضابطہ طور پر وقف رہا۔ جس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو مرثیہ ہی کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

کے مقابل میں لا سکے۔

بقول مولانا شبلی اگر انیسؔ کے مرثیے نہ ہوتے تو اردو دوسری زبانوں کے مقابل نہ ہوتی۔

یعنی اردو کی ابتداء اور انتہا مرثیہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے، تو ہم کو سوچنا پڑے گا کہ اردو لشکر کی تخلیق ہے یا عزاداری کی تبلیغی ضرورت نے اس زبان کی ایجاد کی۔

یہ بحث بہت طویل ہوگی اگر ہم یہ ثابت کریں کہ اردو صرف عزداری حسینؑ کی تخلیقی طاقت کا کرشمہ ہے، کیونکہ اس زبان میں اس کے مصطلحات ہیں، اس کے محاورات میں ایسے امثلہ، ایسے اسماء موجود ہیں جو شیعہ زبان کے سوا دوسرے کے منہ پر کھپ نہیں سکتیں (سکتے)۔ ہم کو زبان اردو کے متعلق اتنا ہی کہنا ہے کہ جتنا اس کا تعلق عزاداری سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو شعراء ۹۹ فیصد شیعہ تھے۔ آپ کی نظر انتخاب جس کو بھی چنے گی وہ شیعہ ہی ہوگا۔

میر تقی میرؔ، مرزا سوداؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، اسیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور وزیرؔ، صباؔ، رندؔ نظیرا کبرآبادی۔ یہ سب شیعہ تھے، اور ہر شیعہ غزل گو نے مرثیہ یا نوحہ ضرور کہا ہے۔

سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے کلیات ملاحظہ ہوں، اس طرح اردو کا وسطی دَور بھی مرثیے سے لبریز نظر آئے گا۔ غالبؔ مرحوم منصف مزاج تھے، انھوں نے میر انیسؔ کے مقابل اپنی شکست کو ضمیر کی فتح سمجھ کر، چند بند کہہ کر پھاڑ ڈالے مگر مرثیہ ضرور کہا۔ اس طرح زبان اردو کا ہر دور مرثیے کے لئے باضابطہ طور پر وقف رہا۔

جس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو مرثیہ ہی کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ عزاداری کے رواج میں ایرانیوں نے زبردست حصہ لیا ہے۔ اور ایرانی یوں تو تیمور اور بابرؔ کے عہد سے ہندوستان پر مسلط تھے، مگر ان کا بڑا جماؤ دکن کے شیعہ

بادشاہوں کے درباروں میں رہا۔ اور اردو بھی دکن ہی میں پیدا ہوئی اس لئے اردو کے آغاز میں ایسے مرکب اسماء زیادہ ملتے ہیں جن میں عربی، فارسی کی بیرونی آمیزش ہے۔ مثلاً عاشورخانہ کا سمجھنا ایک ہندی کے لئے آسان نہ تھا۔ اس لئے اس کو اردو بنانا پڑا۔ اور رفتہ رفتہ عاشورخانہ امام باڑہ ہوگیا۔

فطری جرأت وشجاعت کو سمجھانے کے لئے دکن میں تصاویر تک سے کام لیا گیا ہے۔ آپ جس دیوار پر شیر کی تصویر بنی ہوئی دیکھیں، سمجھ لیں کہ اس کا تعلق عاشورخانے سے ہے یعنی ایک ایرانی مبلغ مافی الضمیر کو ملکی اصحاب کے ذہن نشین کرنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ اور آخری صورت یہ ہوئی کہ کچھ اپنے الفاظ دے کر کچھ مقامی الفاظ لئے۔ اور ان سب نے مل کر اردو کی صورت اختیار کی۔

اردو نے فارسی یا عربی سے مرثیے کا چلن تو لیا مگر عہد بہ عہد اس میں اتنے اضافے کئے گئے کہ اب مرثیے کو خاص اردو ادب کی صنف کہا جائے۔

مبلغین عزاداری نے کمال کیا ہے کہ اپنی تبلیغ میں ہر وہ راستہ اختیار کیا ہے جو مذاق ملک نے دلوں تک سیدھا پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے اس تبلیغ میں کہیں کہیں شریعت سے بھی تجاوز کیا اور علماء نے اصل مقصد کی برتری وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے غض بصر سے کام لیا۔

انہیں مبلغین نے باجوں پر قبضہ کیا۔ یہاں تک کہ شادی کے باجوں سے ماتمی باجوں کے ٹکڑے الگ کردیئے۔ ماتمی نقاروں کی آواز میں آپ ادنیٰ سی توجہ میں امتیاز کرلیں گے۔ سوال جواز اور عدم جواز کا نہیں، یہ دیکھنا ہے کہ جاہلوں میں اور خصوصاً دیہاتوں نے جہاں الف نے اپنی شمع نہ دکھائی تھی، اور ب نے اپنا دیپک نہ جلایا تھا، نام حسینؑ کیونکر پہنچا دیا۔؟ یقیناً اردو اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھی، جب باجوں سے عزاداروں کو اور عوام کو عزاداری کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا۔ اور اسی اظہار واقعہ کے لئے عزاداری میں لڑائی کے کرتب شریک کئے گئے جس پر محرم کے سپاہیوں کا نعرہ یا حسینؑ شاہد ہے۔ جب اردو پیدا ہوئی تو اس میں دو مصرعوں کے ہلکے نوحے نظم کئے گئے۔ ان میں مذہب کے خصوصی مسائل سے کنارہ کشی اختیار کی گئی۔

صرف مظلومیت ہی مظلومیت تھی، تبلیغ میں ترویج بھی تھی۔ عزاداری کو مناظرے سے بچا کر خویش ودرویش دونوں کو ساتھ لینا تھا۔

جب نوحے مجالس میں مقبول ہوچکے تو نظامیؔ وغیرہ کے انداز سے سلام کی صنف پیدا کی گئی، جو نوحے کی طرح خاص مضامین سے خالی نہ تھی، آغاز میں سلامی اور مجرئی کے الفاظ ملا کر اس کو معتقدین کے تقلیدی لباس میں رکھا گیا۔ مگر اب یہ صنف بے نقاب ہوچکی ہے۔ اور بغیر سلامی اور مجرئی کے ہر قسم کے مضامین جو مذہبی ہوتے ہیں پائے جاتے ہیں۔

سلام اور نوحے میں حقیقی فرق وامتیاز ہے۔ مرثیہ بھی ابتداء میں مسدس پر منحصر (نہ) تھا۔ میر مظفر حسین صاحب ضمیرؔ نے اس کو نہ صرف مسدس کیا بلکہ اس کے سارے حدود مقرر کردیئے۔ جن کو مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے انتہائی نقطے تک ترقی دی۔

پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ مرحوم نے اپنا زور طبع صرف دو بحروں تک محدود رکھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے مجتث یا رمل میں نہیں کہا مگر حق یہ ہے کہ ان آخری بحروں کو میر نفیسؔ خلف میر انیسؔ ومرزا اوجؔ خلف مرزا دبیرؔ مرحوم نے مرثیے میں داخل کیا۔

ان دونوں بزرگوں کا زیادہ تر کلام آخر الذکر بحروں میں ہے جب کہ مرزا دبیرؔ میر انیسؔ مرحوم کا زیادہ حصہ کلام اور مشہور مراثی مضارع یا ہزج میں ہیں:

- جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
- جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا
- جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا
- جب حُر کو ملا خلعتِ پر خون شہادت
- کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے

آپ نے غور نہیں فرمایا۔ ان بحروں کے اضافے (نے) اور اس فن کو ترقی دی۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ مرحوم کا طرز ادا بہت سادہ تھا، جب کہ میر انیسؔ کا پڑھنا ایک ٹھاٹ رکھتا تھا۔

مرثیے کا یہ وہ وقت تھا۔ جب صرف کلام ہی نہیں انداز وادا سے بھی اس کو پرتاثیر اور بلند کیا جارہا تھا۔ میر انیسؔ صاحب مرحوم اور شاید ان سے بھی پہلے پڑھنے کا انداز پیدا ہوچکا تھا۔ مگر اس میں اتنی متانت اتنی سنجیدگی تھی کہ آخرکار اس کو خواندگی کا انداز کہا گیا۔ میر انیسؔ مرحوم ایک مجلس میں رونق افروز تھے اور آپ کی اولاد میں ایک بزرگ پڑھ رہے تھے۔

'وہ اٹھا پردۂ در اور وہ حسینؑ آئے'

پڑھنے والے نے ایک ہاتھ پھیلا کر اور کلمہ کی انگلی کو متحرک کرتے ہوئے وہ کا اشارہ پورا کیا۔ مگر اتفاق سے ہاتھ پھیلانے میں گردن میں اتنا بے ضرورت خم پیدا ہوا کہ سرشانے سے مل گیا۔ بھلا میر صاحب کی نزاکت مزاج کب گوارا کرتی ہے زیر منبر ہی فرمایا یہ کاندھی دنیا کہاں سے سیکھا ہے۔

رمل اور مجتث یہ دونوں بحریں ٹھاٹ کے مصرع زیادہ نکالتی ہیں۔ ان بحروں نے متاخرین میں مرجعیت حاصل کی۔

میر نفیسؔ مرحوم نے عون ومحمد کے حال میں معرکۂ جنگ نظم کرتے ہوئے فوج کی پسپائی اور عون ومحمد کی فتحمندی کا ذکر دونوں کی گفتگو میں کیا ہے۔

چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے فوجوں کی کثرت پر ان کے فرار کا تذکرہ کررہا ہے۔

اس جگہ چھپتے ہیں لاشوں کے جہاں تودے ہیں
اماں سچ کہتی تھیں بھیّا کہ بڑے بودے ہیں

میر صاحب نے پہلے تو اس بیت کو بہت سیدھا سیدھا پڑھا، کلام کی خوبی نے مجلس کو بے چین کردیا۔

اوراس کے بعد دوبارہ پڑھنے کی فرمائش پر:

اس جگہ چھپتے تھے لاشوں کے جہاں تودے ہیں
ہاتھ پھیلا کر مرثیہ کی اوٹ سے لاشوں کے تودے صورت کشی کرتے ہوئے دوسرا مصرعہ پڑھا۔

'اماں سچ کہتی تھیں بھیّا' نرم اور طعنہ خیز آواز اور 'بڑے بودے ہیں' کو ماتھے پر شکن اور ہاتھوں کو پستی کی طرف جھٹک کر ادا کیا۔ مجلس اس انداز پر دوبارہ بے چین تھی، اس طرح کلام کا اثر دوہرا ہوجاتا ہے۔

سوزخوانی تحت اور آغاز مجلس میں ہوتی تھی۔ گویا بلند آواز سے راہ چلتوں کو آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سازخوان تھا، اس لئے اس کو سوزخوان کہا گیا اور ساز کو مزاج اسلام کے لئے سازگار نہ سمجھا گیا۔ سوزخوانی کے بڑے بڑے اہل کمال ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور انہوں نے تبلیغ عزاداری میں پورا حصہ لیا۔ گوالیار کی ریاست کی عزاداری کا آغاز ایک سوزخوان ہی سے ہوتا ہے جو مہاراجہ گوالیار کے یہاں گانے والوں میں ملازم تھا۔ مہاراجہ نے اس کی سوزخوانی سے حسینؑ کو پہچانا اور پھر امام حسینؑ کو شاید خود بھی عزاداری پھیلانی مقصود تھی، اس لئے چند در چند معجزے ہوتے گئے، آخر عزاداری گوالیار میں قائم ہوکر رہی۔

سوزخوانی کا موجد وہی تانسین تھا جو اکبری دربار کے نورتن میں شامل ہے۔ کیونکہ اسی کا نواسہ خوش حال خاں حیدرآباد کی ریاست میں منصور الدولہ کا ملازم تھا۔ یہی وہ خوش حال خاں ہے جس کی کمان (پھاٹک محراب دار) کوہ مولا (حیدرآباد) پر آج بھی موجود ہے۔ اور اسی کے قریب خستہ وشکستہ سا اس کا مزار ہے۔

اس کمان سے تھوڑے فاصلے پر ماہ لقا چنداس کی حسین وخوب صورت بیٹی ایک باغ میں محو آرام ہے جو خود بھی سوزخوانی میں مشہور تھی۔

اگر آپ حیدرآباد کی سوزخوانی سنیں گے جو یو۔ پی۔ کی سوزخوانی سے بالکل الگ اور مختلف ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ جس نے سوزخوانی کو ساز سے الگ کیا ہے وہ کامل الفن شخص تھا۔

یو۔ پی۔ کی سوزخوانی کو یقیناً گانا نہیں کہا جاسکتا اور وہ امتیاز جو حیدرآبادی سوز میں ہے۔ وہ یہاں یو۔ پی۔ میں کہیں نظر نہیں آتا۔

سوزخوانی ختم ہونے پر منبر پر پیش خوانی ہوتی تھی اس میں اصل ذاکر کا کوئی شاگرد یا عزیز، رباعی، سلام یا مرثیہ کے چند بند پڑھ کر اُتر آتا تھا۔ اور مرثیہ خوان اس پیش خوانی سے مجلس کا ماحول معلوم کرلیتا تھا۔

سوزخوانی کے بعد مرثیہ خوانی کی باری ہے۔ ہم نے ایسے بھی مرثیہ پڑھنے والے دیکھے ہیں جو بتانے کی کوشش میں منبر سے اُتر آتے تھے۔

اسی طرح دورِ آخر میں میر خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروجؔ کے پڑھنے کا جواب نہ تھا۔

'وہ بلندی پہ ستارا، کہ چمکتا ہے علم'

اس انداز سے پڑھے کہ آدھی مجلس کھڑی ہوگئی۔

مرثیہ خوانی کے بعد نثرخوانی کا دور تھا۔ یہ فن فارسی سے لیا گیا ہے، مگر پڑھنے کے انداز نے اس کو بھی ہندوستانی بنادیا۔ نثرخوان منبر پر جاکر رباعی، قصیدہ اور متفرق اشعار سے اپنے کلام کا آغاز کرتا تھا۔ اس کے بعد چہرہ شروع ہوتا تھا۔ اس میں فارسی ادب کی تقلید کی جاتی تھی، پھر اردو تقریر مقفیٰ ومسجع شروع ہوتی تھی، جیسا کہ اس عہد کا مذاق تھا، بچہ بچہ فارسی سے واقف تھا۔ فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرور کی نثر اس نثر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اس نثر کی خوبی کے ساتھ محل وموقع پر اشعار اور مرثیہ کے بند اس ٹھاٹ سے پڑھے جاتے تھے، کہ مجلس بے قرار ہوجاتی تھی۔

احمد حسین قمرؔ، منشی احمد حسین جاہؔ (مصنفین طلسم ہوش ربا) رام پور میں ملازم تھے۔ ایسی ایسی مجلسیں پڑھیں کہ نواب عابد علی خاں مرحوم نے موتیوں سے منہ بھر دیا۔ ایک شخص مجلس میں بیٹھا کہ کیا مجال جو آنکھ سے آنسو نکلے۔ اور ذاکر نے منبر پر دعویٰ کیا کہ آدمی تو کیا چیز ہے پتھر بھی تڑق کر یا حسینؑ کہے، جب مجلس پڑھ کر اترے تو یہ شخص روتے روتے بے ہوش ہوچکا تھا۔

آخری دور میں میر ولایت حسین صاحب ولاؔ مرحوم رام پور میں نثرخوانی کرتے تھے۔

نثرخوانی کے بعد روضہ خوانی تھی، اس میں اکثر ملا واعظ کاشفی کی روضۃ الشہداء فارسی یا اردو ترجمہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر کتاب خوانی ہوتی تھی، اور یہ گویا ہماری موجودہ ذاکری اور واعظی کے آغاز کی صورت تھی۔ اس میں بعض خوش الحان مختصر فضائل اور پھر مصائب لحن سے پڑھتے تھے۔

حضرت بحر العلوم مولانا سید محمد حسین عرف علن صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہ نے ذاکری کے بیان کو اتنی وسعت دی کہ علوم وفنون بھی اس بیان میں شامل ہوگئے۔ حضرت بحر العلوم کے آخری زمانہ میں مولانا مقبول احمد صاحب مرحوم نے مناظرے کو عام کیا۔ اسی کے ساتھ خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن مرحوم اور مولانا مولوی محمد رضا صاحب شمس آبادی اعلیٰ اللہ مقامہ نے اس فن واعظی کو معراج کمال تک پہنچادیا۔

کتاب خوانی کے بعد واقعہ خوانی ہوتی تھی، ذاکر منبر پر لہجہ کے ساتھ واقعہ بیان کرتا تھا اور زیر منبر اسی کے ساتھی موجود ہوتے تھے۔ ذاکر واقعہ بیان کرتے ہوئے ایک مصرع پڑھتا تھا۔ زیر منبر بیٹھے ہوئے لوگ اس مصرع کو دہراتے تھے۔ واقعہ کے بعد نوحہ خوانی ہوتی تھی، جو لکھنؤ میں ایک انجمن چک چکیوں پر کھڑے ہوکر نوحہ پڑھتی تھی۔

آخری زمانے میں چک چکی کی جگہ ہاتھ سے سینے پر ضرب لگائی جانے لگی اور اس انداز کا ماتم ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔

ماتم یا نوحہ خوانی کے بعد پھر ترویح تھی، جس میں نظماً ائمہ معصومین کے واسطے سے اہل مجلس وبانی مجلس کے لئے دعا ہوتی تھی، آخر میں سورۂ فاتحہ پڑھوایا جاتا تھا۔ اور مجلس عزا ختم ہوتی تھی۔

❑❑❑

حسینیہ غفرآنماب کے عہد بہ عہد حالات

مولانا سید مصطفیٰ حسین اسیف جائسی
مدیر ماہنامہ شعاع عمل، غفرانمآب، لکھنؤ
موبائل: 8736009814

آیۃ اللہ سید دلدار علی غفران مآبؒ اُس ذات گرامی کا نام نامی ہے جس نے عراق وایران سے بحیثیتِ فقیہ ومجتہد جامع الشرائط ہندوستان واپس آکر حسب خواہش رئیس دیندار سرفراز الدولہ نواب حسن رضاخاں لکھنؤ میں قیام فرمایا اور کئی سالوں تک شہر لکھنؤ میں اصلاح وتبلیغ کا کام انجام دیا ساتھ ہی دوسرے اضلاع میں جاکر علماء سے مناظرے اور مباحثے بھی کئے جب کافی حد تک اخباریت کو شکست دے لی تو ایک دن یہ ہمت بھی کرہی لی کہ اب شیعیان ہند کی نماز جماعت قائم کی جائے اور نواب حسن رضاخاں کے محل میں ۱۳؍رجب ۱۲۰۰ھ روز جمعہ نماز ظہرین پڑھائی جس میں نواب آصف الدولہ کے علاوہ دوسرے نواب زادگان ورؤساء شریک تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جماعت تھی۔ غور طلب بات ہے کہ جمعہ کا دن اور وہ شخص مقتدیٰ ہے جو نماز جمعہ کے سلسلے میں استدلالی رسالہ بھی تحریر کرچکا ہے اور جس کا مطالعہ نوابین وعہدیداران وتعلیم یافتہ حضرات کربھی چکے ہیں پھر بھی نماز کسی مسجد میں نہ ہوکر قصر حسن رضاخاں میں ہورہی ہے اور جب قصر میں ہورہی ہے تو لامحالہ عوام کا زیادہ گذر نہ ہوگا بس خواص ہی خواص ہوں گے اور پھر نماز جمعہ ہوئی بھی تو ۲۷؍رجب ۱۲۰۰ھ کو شاید نواب ہی کے قصر میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقیہ کی نظر دیکھتی ہے کہ کب کیا ہونا چاہئے، چند سال تبلیغی واصلاحی کوششیں کیں پھر جمعہ کے دن ۱۳؍رجب کو نماز ظہرین قصر نواب میں پڑھا کر پہلے خواص کو عملاً اپنا ہم خیال بنالیا پھر نماز جمعہ کی تیاری شروع کردی۔ بہرحال جتنی بھی کسر رہ گئی تھی اسے پوری کرکے آخرکار ۲۷؍رجب کو نماز جمعہ پڑھا دی۔ غفران مآبؒ کے بڑے فرزند سلطان العلماء حضرت رضوان مآبؒ کی ولادت باسعادت

> غفران مآبؒ کے عہد سے سلطان العلماء بلکہ ملک العلماء کے بعد بحر العلوم تک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا زمانہ رہا چونکہ مرثیے کے کچھ اجزا ضمیرؔ لکھنوی ہی کے وقت میں طے ہوگئے تھے اور پھر عہد انیسؔ ودبیرؔ میں تو یہ فن شباب پر تھا، ایک ہی واقعہ کو طرح طرح سے نظم کرنا کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اس تغیر وتبدل میں بات یا واقعہ کچھ کا کچھ ہوجاتا تھا اور کبھی کبھی طبع زاد واقعہ نظم ہوتا تھا یہ بات فقہاء وعلماء خاندان اجتہاد کو ناگوار گذرتی تھی چنانچہ ابتداء ہی میں اپنے ہی عزاخانے میں غفران مآبؒ نے ایک غلط تخیل نظم کرکے پڑھتے ہوئے میر ضمیر کو ٹوک دیا بلکہ یہ کہہ کے منبر سے اتار لیا کہ یہ غلط بیانی کی جگہ نہیں ہے۔

۱۷؍صفر ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء کو لکھنؤ میں ہوئی اور نماز جمعہ ۲۷؍رجب ۱۲۰۰ھ میں ہوئی اس بات سے عام آدمی بھی یہ نتیجہ تو نکال ہی سکتا ہے کہ ابھی علمی اعتبار سے غفران مآبؒ کی ذات تن تنہا ہے پھر بھی اخباریت نیز صاحبان اقتدار کی غلط کاریوں سے مقابلہ کرکے شیعوں کو بحیثیت قوم پیش کردیا ہاں اتنا ضرور ہے کہ غفران مآبؒ کے امور خیر میں شریک وسہیم خاص طور پر نواب حسن رضاخاں اور چند رفقاء اور ممکن ہے کچھ مبتدی تلامذہ ہوں لیکن آہستہ آہستہ وسیع وعریض ہندوستان میں بسنے والے مومنین کے لئے رسالے کے رسالے تیار کردیئے۔ پہلے اپنے شریعت کدہ پر اور پھر حسینیہ میں جسے علماء دارالسلام ہند کہتے تھے مدرسۂ علم واجتہاد قائم فرمایا اور جس کے سیکڑوں طلاب کو اجازۂ پیش نمازی دے کر ہندوستان بھر میں بکھیر دیا انھیں تلامذہ میں تقریباً ایک درجن علماء ایسے بھی تھے جو درجۂ فقاہت واجتہاد پر فائز ہوئے اور خود غفران مآبؒ نے انھیں اجازات اجتہاد بھی عطا فرمائے جن میں سے آپ کے بیٹے آیۃ اللہ سید مہدی کا جوانی میں انتقال ہوگیا مگر دو فرزند یعنی سید العلماء آیۃ اللہ سید حسین علیین مکان (جنھیں چھوٹے قبلہ وکعبہ یا میرن صاحب کہا جاتا تھا) پہلے اور ان کے بعد سلطان العلماء آیۃ اللہ سید محمد رضوان مابؒ (جنھیں بڑے قبلہ وکعبہ کہا جاتا تھا اور جو اودھ میں حکومت شرعیہ کے بانی تھے) بعد میں پوری دنیائے شیعیت میں اعلم مانے گئے، اس بات کو صاحب جواہر اور صاحب ضوابط کی تحریروں سے سمجھا جاسکتا ہے اور مزید معلومات کے لئے علامہ مفتی میر محمد عباس شوستریؒ کے تصانیف (۱) اوراق الذہب (عربی، حالات سید العلماءؒ) (۲) ظل ممدود (مکاتیب عربیہ علماء اعلام واجوبۂ مکاتیب) (۳) ظل ممدود (مکاتیب فارسیۂ علماء عظام وجوابات خطوط) (۴) رطب العرب (دیوان عربی) (۵) مرتضیات

حُسینیہ (فارسی، حالات سید العلماءؒ) (۶) اخلاق حسینیہ (فارسی، حالات سید العلماء) وغیرہ کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

غرض کہ ایک غفران مآبؒ اور دسیوں کام۔ (فرزندان وتلامذہ تو پندرہ بیس سال بعد ہاتھ بٹائیں گے) تمام علوم کی تدریس بھی فرما رہے ہیں اور مخالف علماء سے مناظرے اور مباحثے بھی کررہے ہیں، بدعات وبے جا رسوم کا خاتمہ بھی کررہے ہیں اخباریت پر زبان وقلم سے بھرپور وار بھی، شیعوں کے عبادات وتبلیغی اجتماعات کے لئے مسجدیں اور عزاخانوں کی جگہ جگہ تعمیر بھی ہورہی ہے اور سنی شیعہ اتحاد کی فضا بھی سازگار کی جارہی ہے، عوام کے ساتھ نوابین وحکام تک کو پابند دین ومذہب بھی کیا جارہا ہے اور خلق خدا کے سیراب ہونے کے لئے جابجا کنویں بھی بنوائے جارہے ہیں بلکہ عراق میں نہر آصفی بھی تیار ہورہی ہے۔ ایک طرف بڑے کتب خانے کی تشکیل میں مصروف تو دوسری طرف تحقیق وتصنیف میں مشغول اور ایسے کارنامے کہ دنیا بھر کے علماء حیرت میں پڑ گئے، اگر غرباء ومساکین کی امداد ہورہی ہے تو طلاب دینیہ کا جی بھر تعاون بھی اور یہ سلسلہ صرف لکھنؤ پر ختم نہیں ہوا بلکہ نجف، کربلا اور دیگر مقامات مقدسہ کے علماء وطلاب تک کو مدد پہنچائی جانے لگی ساتھ ہی روضۂ حضرت امام حسین ارواحنالہٗ الفدا کی تعمیر میں حصہ اور ۱۲۱۹ھ تک تو ہر تحریک کامیاب ہی کامیاب اور عہد امجد علی شاہ میں جب حکومت شرعیہ کا قیام ہوا تو (اگرچہ حضرت غفران مآبؒ رحلت فرما چکے تھے) تحریک غفران مآبؒ کو معراج ہی حاصل ہوگئی تھی۔

جہاں جناب غفران مآبؒ دیگر امور خیر کی تعمیل کے لئے بے حد کوشاں رہے وہیں نشر حسینیت وترویج عزاداری میں ساری زندگی کمربستہ رہے اور یہ کام ان کی نظروں میں اتنا اہم تھا کہ دنیا سے جاتے جاتے اپنے فرزندوں کو عزائے سید الشہداؑ کو فروغ دینے کی وصیت بھی کرتے گئے یہی وجہ ہے کہ آج بھی تقریباً تیس تصانیف خصوصاً اثارۃ الاحزان علیٰ القتیل العطشان (معتبر مصائب حضرت سید الشہدائے کربلا بزبان عربی) اور دو مسجدوں کے علاوہ دو عزاخانے آپ کی یادگار ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت غفران مآبؒ اور ان کے پانچ آیات عظام فرزندوں کے تلامذہ سے جو علمی خانوادے تیار ہوئے کسی کی یادگار میں کوئی قابل ذکر امامباڑہ نہیں ہے لیکن حضرت غفران مآبؒ نے ایک عزاخانہ اپنے وطن میں بنوایا اور ایک لکھنؤ میں اور دونوں حسینیۂ غفران مآبؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے اکبر اولاد سلطان العلماء کے فرزند اکبر منصف الدولہ شریف الملک مولانا سید محمد باقر نے ایک کربلا تعمیر کروائی جو کربلائے منصف الدولہ یا مولوی صاحب کی کربلا یا کربلائے مہدی گنج کے نام سے مشہور ہے اور جناب کے اصغر اولاد سید العلماء سید حسین کے دو نامور فرزندوں یعنی ممتاز العلماء سید محمد تقی اور زبدۃ العلماء سید علی نقی نے الگ الگ امامباڑے بنوائے جو حسینیہ جنت مآبؒ اور حسینیہ مولانا علی نقی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں اور سب ہی میں سال بھر مجلسوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہندوستان کیا ایران وعراق میں بھی روضہ خوانی (ذاکری) کم علم یا بے علم افراد کرتے تھے مگر غفران مآبؒ نے ہندوستان میں اس کمی کو یوں پورا کیا کہ مواعظ اور فضائل ومصائب کے لئے منبر کو اپنایا اور پھر ان کی نسل کے زیادہ تر فقہاء وعلماء جناب کی سیرت پر عمل کرتے رہے اور آج جس ڈھنگ کی ذاکری رائج ہے اس کے بانی بھی خاندان اجتہاد ہی کے ایک عظیم فقیہ ومحقق یعنی بحر العلوم آیۃ اللہ سید محمد حسین (جناب علّن صاحب) طاب ثراہ ہیں۔

بحر العلوم کے بعد اس خانوادے کے علماء نے اپنی شہرۂ آفاق ذاکری کے ذریعہ جو عزا کی خدمت کی وہ قطعاً ناقابل فراموش ہے اس گروہ کے سربرآوردہ افراد میں خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن فاطرؔ، کہف العلماء آیۃ اللہ سید ابن حسن، حکیم الامۃ علامۂ ہندی آیۃ اللہ سید احمد، ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء آیۃ اللہ سید کلب حسین (کبّن صاحب)، سید العلماء آیۃ اللہ سید علی نقی نقوی، خطیب اکبر سید الواعظین مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ (للّن صاحب)، فقیہ مؤتمن ممتاز العلماء سید ابوالحسن (منن صاحب پدر سید العلماءؒ)، انتخاب العلماء عمدۃ الواعظین مولانا سید سبط محمد ہادی (کلّن صاحب)، صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب رحمت مآب اور علّامہ نصیر اجتہادی طاب ثراہم ہوئے ہیں۔ اور آج بھی ممتاز حیثیت سے مفکر اسلام ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ، قائد ملت حجۃ الاسلام مولانا سید کلب جواد صاحب قبلہ اور خطیب انقلاب مجاہد ملت سید حسن ظفر صاحب قبلہ وغیرہم مستقل خدمتِ عزا میں مصروف ہیں۔

غفران مآبؒ کے عہد سے سلطان العلماء بلکہ ملک العلماء کے بعد بحر العلوم تک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا زمانہ رہا چونکہ مرثیے کے کچھ اجزا ضمیر لکھنوی ہی کے وقت میں طے ہوگئے تھے اور پھر عہد انیسؔ ودبیرؔ میں تو یہ فن شباب پر تھا، ایک ہی واقعہ کو طرح طرح سے نظم کرنا کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اس تغیر وتبدل میں بات یا واقعہ کچھ کا کچھ ہوجاتا تھا اور کبھی کبھی طبع زاد واقعہ نظم ہوتا تھا یہ بات فقہاء وعلماء خاندان اجتہاد کو ناگوار گذرتی تھی چنانچہ ابتداء ہی میں اپنے ہی عزاخانے میں غفران مآبؒ نے ایک غلط تخیل نظم کرکے پڑھتے ہوئے میر ضمیرؔ کو ٹوک دیا بلکہ یہ کہہ کے منبر سے اتار لیا کہ یہ غلط بیانی کی جگہ نہیں ہے اور فوراً سلطان العلماء سے کہا کہ منبر پر تشریف لے جایئے اور آج سے آپ خطاب فرمائیں گے چنانچہ اب سلطان العلماء ذاکری فرمانے لگے اور دس محرم کی مجلس ہمیشہ

غفران مآبؒ ہی پڑھتے تھے۔ سلطان العلماء کے بعد ملک العلماء مغفرت مآبؒ نے ذاکری کی ان کے بعد ملاذ العلماء آیۃ اللہ سید ابوالحسن صاحب اور بحر العلوم آیۃ اللہ سید محمد حسین علّن صاحب نے اور ان لوگوں کے بعد آیۃ اللہ سید ابوالحسن رضوی کشمیری شاگرد رشید تاج العلماءؒ نے چند سال ذاکری کی اور ان کے ارتحال کے بعد بحکم قدوۃ العلماء عمدۃ العلماء ذاکر شام غریباں مولانا کلب حسین صاحب قبلہ نے ذاکری کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے، کبّن صاحب کے انتقال کے بعد سے صفوۃ العلماء مولانا کلب عابد صاحب قبلہ نے مجلسیں پڑھی اور اب مولانا کے جانشین قائد ملت خطاب فرما رہے ہیں۔

گذشتہ سطور میں میں نے یہ بات لکھی تھی غفران مآبؒ اور ان کی اولاد امجاد کے علاوہ ان کے تلامذہ میں جو علمی خانوادے تیار ہوئے ان میں سے کسی نے بھی اقامت عزاء ونشر حسینیت کے لئے کوئی قابل ذکر مرکز یعنی حسینیہ تعمیر نہیں کیا اور نہ ہی ان میں کوئی لائق ذکر ذاکر ہوا یہ جو چند دنوں سے علمی خانوادے میں ایک ایک ذاکر دکھائی دے رہے ہیں یہ خدمت عزا کے سلسلے کی پہلی ہی کڑیاں ہیں۔

غفران مآبؒ کا میر ضمیرؔ کو منبر سے اتار لینے کے بعد خاندان اجتہاد کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ فن نہیں بلکہ فریضۂ مرثیہ نگاری کو بھی علماء کے سپرد کیا جائے چنانچہ فقہاء ہی کے اشارے پر خاندان اجتہاد کے کچھ علماء نے مرثیہ نگاری پر خصوصی توجہ دی اور پھر تاریخ شاہد ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ کے چار دبستان ہوگئے یعنی دبستان عشقؔ، دبستان انیسؔ، دبستان دبیرؔ اور دبستان خاندان اجتہاد۔

دبستان خاندان اجتہاد کے ان ممتاز شعراء کے اسماء پیش ہیں جو علماء میں بھی محسوب تھے۔ مولانا سید محمد جعفر امیدؔ اجتہادی، خلاق مضامین مولانا نواب سید مہدی حسین ماہرؔ اجتہادی، مولانا محمد اصطفا (لڈن صاحب) خورشیدؔ اجتہادی، استاذ الاساتذہ مولانا نواب سید اصغر حسین فاخرؔ اجتہادی، ملک الشعراء مولانا سید بندہ کاظم جاویدؔ اجتہادی، عمدۃ الشعراء مولانا سید ساجد حسین فہیمؔ جائسی، دعبل ہند مولانا سید فرزند حسین ذاخرؔ اجتہادی، فخر الذاکرین مولانا وجاہت حسین ناظمؔ اجتہادی، لسان الشعراء مولانا سید مجاور حسین تمنّاؔ جائسی، سید الواعظین خطیب اکبر مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ وغیرہم نیز غیر علماء میں شاعر امامی سید صادق علی ''چھنگا صاحب''، حسینؔ جائسی وغیرہم اور نوحہ نگاری کو تو اس خانوادے کے شعراء نے آسمان ہفتم پر پہنچا دیا بلکہ ایک ایسا زمانہ گذرا ہے کہ ہندوستان میں صرف خاندان اجتہاد کے علماء وشعراء ہی کے نوحے زیادہ تر پڑھے جاتے رہے ہیں۔ آیئے اب اس ماتم کدہ کی تاریخ پیش کریں جو ہندوستان میں سب سے اہم تبلیغ حقائق ومعارف اسلام، نشر حسینیت اور ترویج عزائے سید الشہداء علیہ التحیۃ والثنا کا مرکز ہے یعنی غفران مآبؒ کا امامباڑہ۔

حسینیہ حضرت غفران مآبؒ تاریخ کی روشنی میں

۱۲۱۰ھ میں غفران مآبؒ نے ایک غیر پختہ عزاخانہ تعمیر کروایا جو علامہ کا مدرسۂ علم واجتہاد بھی تھا اور فروغ عزاداری کا مرکز بھی اور یہی سنہ قدوۃ العلماء نے ''حالات خاندانی'' میں اور سید العلماء نے ''تذکرۂ عمدۃ العلماء'' میں تحریر فرمایا ہے اور خود عمدۃ العلماء نے اپنے بیان مجلس شام غریباں میں یہی سن پیش کیا ہے۔ لیکن پختہ اور عالی شان عزاخانے کی حیثیت سے ۱۲۲۷ھ میں تعمیر ہوا جیسا کہ جائس کے مشہور تاریخ نگار سراج الشعراء مولانا سید آل محمد مہرؔ جائسی نے اپنی کتاب ''خاندان اجتہاد کے علمی وادبی خدمات'' میں اور مشہور سوانح نگار زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی نے اپنے مضامین اور کتابوں میں اور دیگر علماء وادباء نے تحریر فرمایا ہے اور بندہ نے ایک مخطوطے میں اس کا تاریخی نام ''رشک جنّت'' پڑھا ہے اور مولانا سید تقی حسن نقوی تقیؔ جائسی نے ''تاریخ جائس'' میں اس کا تاریخی نام ''آخرت گاہ'' تحریر کیا ہے۔

۱۲۳۱ھ میں غفران مآبؒ کے فرزند علامہ وفقیہ کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے والد کے امامباڑہ میں مدفون ہوئے مدرسہ عزاخانہ میں چل ہی رہا ہے پھر غفران مآبؒ نے کچھ کمرے اساتذہ وطلاب کے لئے اور تعمیر کروائے تو خود ہی تاریخ نکالی:

''مزار و مدرسہ ہم جائے ماتم سبطین''

۱۲۳۴ھ

نجم العلماء مولانا سید ہدایت حسین ابن زبدۃ العلماءؒ ابن سید العلماءؒ ابن حضرت غفران مآبؒ نے اپنی کتاب ''نجوم تواریخ'' (۱۳۱۶ھ) میں لکھا ہے کہ غفران مآبؒ نے ''شہر لکھنؤ میں بھی ایک وسیع و پُرفضا امام باڑہ تعمیر فرما کر وقف فرمایا اور اس مقام کو مجلس فضائل ومصائب، مدرسہ اور محل قبور مقرر فرمایا جیسا کہ مصرع مادّۂ تاریخ جو کہ خود جناب غفران مآبؒ نے نظم فرمایا ہے اور دیوار امامباڑہ مذکور میں بقلم جلی لکھوایا ہے جو بخوبی واضح ہوتا ہے اور وہ مصرع یہ ہے ''مزار و مدرسہ ہم جائے ماتم سبطین'' (۱۲۳۴ھ) اور اسی امام باڑہ میں وہ جناب مدفون ہوئے اور اکثر خاندان اجتہاد ودیگر علماء وفقہاء واتقیاء کے قبور ہیں الحق کہ یہ امام باڑہ نہایت مقام طیب وطاہر وجائے نزول رحمت حضرت غافر ہے اور بعد عتبات عالیات عرش درجات کے یہ زمین بھی کم از روضۂ جنت نہیں ہے اور اسی امام باڑے کے جانب غرب ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی ہے مگر حیات میں انجناب کے تعمیر نہ ہونے پائی تھی بعد انتقال انجناب کے صاحبزادہ سلطان العلماء نے تعمیر فرمائی''۔

۱۹/رجب ۱۲۳۵ھ کو حضرت غفران مآبؒ نے رحلت فرمائی، لکھنؤ کیا پورا ہندوستان ماتم کدہ بن گیا جگہ جگہ ہندوستان میں غفران مآبؒ کی ترحیم روح کے

لئے مجالس وقرآن خوانی واطعام کا سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ اس عہد کا کون سا عربی، فارسی اور اردو کا شاعر تھا جو مراثی وقطعات تواریخ نظم کرنے میں مصروف نہ رہا ہو یہی نہیں بلکہ ایران وعراق کے فقہاء وعلماء واد باء بھی ہندیوں کے اس غم میں شریک رہے اور ان میں سے بہتوں نے مراثی نظم کر کے سلطان العلماء وسید العلماءؒ کے پاس بھیجے۔

سلطان العلماء رضوان مآبؒ نے اپنے عہد میں امام باڑہ سے متصل ایک مسجد تعمیر کی جو اب بھی پرانی تعمیر ہی کی صورت میں موجود ہے۔ جس کے سنگ تعمیر پر کندہ ہے:

اَشْهَدُ اَنَّ مَوْلَانَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ

۱۲۳۹ھ

۱۲۹۰ھ میں جناب سید واجد علی صاحب رئیس کی کوشش سے عمارت حسینیہ میں کچھ ترمیم ہوئی اور صدری دروازہ تعمیر ہوا

''شیعہ کانفرنس کی ایک روئیداد سے پتہ چلتا ہے کہ امام باڑہ کی شیعہ کانفرنس کی جانب سے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۱ء کے درمیان کچھ مرمت ہوئی تب بھی بہت کچھ باقی تھی، یہ عزاخانہ کی روک تھام کا سبب ہوئی لیکن افسوس کہ اس مرمت میں اس کے بہت سے کتبے چونے سے سفید ہو گئے اور اب صرف ایک شجرہ جو قبر اقدس حضرت غفران مآبؒ کے حجرے کی دیوار پر موجود رہ گیا ہے حالانکہ وہ بھی جا بجا سے مٹ گیا ہے لیکن اگر وہ باقی ماندہ بھی مٹ گیا تو ایک بڑی چیز ہاتھ سے جاتی رہے گی۔''

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس ہشتم منعقدہ ۱۸، ۱۹، ۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۷، ۲۸، ۲۹/ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ بمقام رفاہ عام کلب لکھنؤ زیر صدارت آیۃ اللہ علامہ سید علی حائری لاہوری کی روئیداد مرتبہ مولانا سید علی غضنفر اجتہادی جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس میں نواب سید محمد ذکی خاں صاحب ہاتفؔ کی سفارتی رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی جس میں ہاتفؔ مرحوم لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ تہذیب وشائستگی، خلق ومروت، فصاحت وبلاغت، سخاوت وایمانداری، خوش وضعی ووضعداری کے علاوہ قومی بلکہ مذہبی اعتبار سے تمام ہندوستان میں ایک نہایت درجہ ممتاز، قابل فخر اور دار العلم والعمل ہے، جو اپنی ندرت کے اعتبار سے قلب ہندوستان کے مبارک لقب سے مخاطب ہونے کا پورا مستحق ہے.....فرمانروایانِ سلطنت اودھ کا ۱۱۳۲ھ سے ۱۲۷۲ھ تک یعنی ایک سو اکتالیس سال تک دار السلطنت رہا ہے جہاں کے تاجدار از ابتدا تا انتہا سب ہی شیعیان حیدر کرار علیہ السلام تھے، اسی بنا پر سلطنت اودھ، سلطنت ایران کے بعد تمام عالم میں عدیم النظیر سلطنت تھی جس کے بقیہ آثار ہی دیکھ کر کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔..... امام باڑہ جناب غفران مآبؒ حجۃ الاسلام آیۃ اللہ فی الانام جناب مولانا السید دلدار علی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کا بنا کردہ ہے اور محلہ پاٹانالہ میں واقع ہے نہایت مقدس ومتبرک وقدیم عمارت ہے اور تاریخ اس بنا کی ''مزار ومدرسہ ہم جائے ماتم سبطین'' ہے۔ اس امام باڑے میں اکثر علماء ومجتہدین کے قبور مقدسہ وقفِ خاص میں ہیں اور اکثر مومنین اور جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بعض علماء بھی وقف عام میں دفن ہیں مگر افسوس کہ یہ مقدس عمارت ایسے حال خراب میں مبتلا ہے کہ خود اپنے حال زار پہ زار زار رو رہی ہے۔ امام باڑہ کن کن نائبان حضرت حجۃ عَجَّلَ اللّٰهُ فَرَجَهُ الشَّرِيْف کی خوابگاہ ہے ان میں سے ہر ایک بزرگوار اپنے اپنے زمانے میں حجۃ الاسلام، آیۃ اللہ فی الانام، محیی السنۃ اور قامع الضلالۃ والبدعۃ تھا۔

''تذکرۂ جناب عمدۃ العلماءؒ'' میں ہے (بقول رازؔ اجتہادی) کہ حسینیۂ غفران مآبؒ ۱۹۱۵ء کی برسات میں شکست وریخت کی زد میں آیا مولانا سید سبط محمد ہادی عرف مولانا کلّن صاحب کی کوشش سے کچھ اس کی مرمت ہو سکی پھر ایک مرتبہ اس کی شہ نشین دھنس گئی۔ جناب عمدۃ العلماء نے ڈھائی تین ہزار روپئے کے خرچ سے میرے زیر نگرانی اس کی تعمیر کرائی۔

۱۹/ رجب ۱۳۳۶ھ کو زیر سرپرستی قدوۃ العلماء طاب ثراہ حسینیۂ غفران مآبؒ میں حضرت غفران مآبؒ کی صد سالہ یادگار کی عظیم الشان مجلس منعقد ہوئی۔

مولوی منّے آغا صاحب رازؔ تذکرۂ عمدۃ العلماء میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''پھر ۱۹۳۶ء کے سیلاب میں اُس (حسینیۂ غفران مآبؒ) کے دونوں پہلوؤں کے کمرے مسمار ہو گئے۔ جناب مرحوم نے لکھنؤ سے نیز جہاں بسلسلۂ ذاکری تشریف لے گئے حسینیۂ غفران مآبؒ کے واسطے بارہ ہزار روپئے مہیّا کئے، مرزا سجاد حسین صاحب کی نگرانی میں تعمیر کروائی جس کی وجہ سے تقریباً چھ سو روپئے سالانہ حسینیۂ مذکورہ کی آمدنی ہو گئی، یہ رقم جناب ہی کی نگرانی میں مجالس میں صرف ہوتی رہی اور ہر خسارہ کو مرحوم اپنی جیب سے پورا کرتے رہے۔''

شیعی دنیا میں شام غریباں کی مجلس اسی عزاخانے کی ایجاد اور یادگار ہے جس سے قوم کا بچہ بچہ واقف ہے۔

امام باڑہ غفران مآب ترمیم وتزئین کے مراحل سے ایک صدی تک گذرتا رہا جبکہ اب اُسے نئی تعمیر کی ضرورت تھی۔ جس کے لئے صفوۃ العلماء بیحد فکر مند تھے مگر یہ کام قسام ازل نے مولانا کلب عابد صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب کے لئے لکھ چھوڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ۱۹۸۴ء میں امام باڑہ کی جدید تعمیر کی تکمیل ہوئی اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ پائدار، نمایاں اور خوبصورت ہے۔

❑❑❑

مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ ۱۹۸۹

لکھنؤ کی تاریخی عزاداری

ماہ محرم قمری کلینڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ اس مہینہ کی دسویں تاریخ کو کربلا کے میدان میں امام حسین معہ اپنے بہتّر اعزا و رفقا کے شہید کر دئے گئے تھے۔ اس المیہ کی یاد میں تمام مسلمانان عالم محرم آتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور پہلے دس دن سوگ مناتے ہیں۔ اودھ کی سلطنت کے قیام سے پہلے لکھنؤ کے مسلمان بھی یقینا محرم کے ابتدائی دس دنوں میں رائج الوقت مراسم عزا بجالاتے تھے جن میں اسی زمانے کے طرز پر تعزئے بنتے اور رکھے جاتے تھے۔ تعزیہ خالص ہندوستانی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور شاہ نے ہندوستان میں اپنے دوران قیام تعزئے کی بنا ڈالی تھی جس کو بہت جلد رجعیت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ شیخون کے دور اقتدار میں جو عزاداری ہوتی تھی اس میں اسی پرانے طرز کے تعزئے رکھے جاتے تھے اور مراسم میں باک بنوٹ، اکھاڑوں، ڈھول، دماموں، باجوں، تاشوں کا رواج تھا جو مدتوں تک اپنے پرانے طرز ہی پر برقرار رہا تھا۔ اودھ کے فرمانروا کی حکومت قائم ہوتے ہی جدید طرز کی عزاداری معرض وجود میں آ گئی تھی۔ آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دار الحکومت بنایا تو کچھ ہی مدت کے بعد درباری مذہب شیعہ ہو گیا تھا اور بہت جلد میر دلدار علی جو بعد میں مجتہد ہوئے مذہبی امور میں صاحب اقتدار ہو گئے تھے۔ انہوں نے عزاداری کی ترویج ہی نہیں کی بلکہ اس کی طرف میں اصلاحات بھی نافذ کئے۔ انہوں نے شہنائی، روشن چوکی اور ماہی مراتب کو جلوس عزا میں شامل کرنے کی مخالفت کی، مالک اور پٹے کے کرتیوں کو عزاداری کی متانت کے منافی قرار دیا، جانوروں کی تصاویر اور ان کے مجسموں کو استعمال کرنا خلاف شرع قرار دیا اور ان سب لوازمات کے بجائے جنگی باجے کی اجازت دی۔ تعزیوں کے جلوس میں مہندی، علم اور ذول الجناح کی شمولیت کو جائز قرار نہیں دیا بلکہ ہمت افزائی کی کیونکہ یہ تمام نئے لوازمات عزاداری کے جلوسوں مین ضروری قرار پا گئے لیکن ان کے ممنوعات بھی برقرار رہے کیونکہ عوام میں ان کی مقبولیت مسلم تھی اور اودھ کے حکمراں اتنے وسیع النظر تھے کہ انہوں نے اپنی رعایا کے مذہبی رجحانات میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت کبھی پسند نہیں کی۔ درباری عزاداری میں مجتہد کا حکم جاری وساری ہو گیا لیکن عوام کا چلن اپنے طرز پر برقرار رہا۔

محرم اور عزاداری کا یہ سلسلہ بہرحال دس دن تک جاری رہتا تھا اور محرم کی بارہویں تاریخ کو سوگ نشینی کی مدت ختم ہو جاتی تھی۔ یہی دستور آصف الدولہ، سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے زمانے تک جاری رہا تھا۔ غازی الدین حیدر کے صاحبزادے اور جانشین نصیر الدین حیدر فرمانروا ہوئے تو ان کی ملکہ نے امور مملکت میں کافی دخل حاصل کر لیا تھا۔ وہ کٹر قسم کی مذہبی خاتون تھی اور شیعیت میں ان کے رجحانات ہندوؤں کے رسم ورواج سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ یہ انہیں کا اثر تھا کہ بادشاہ نے محرم کے مراسم میں اضافے کر کے بیسویں صفر تک سوگ نشینی کی مدت کو بڑھا دیا۔ نصیر الدین حیدر کو عزاداری اور سوگ نشینی سے

> 'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'
>
> ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان وشوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔
>
> پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جوجھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔
>
> 'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'
>
> اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی چھٹی کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' سے ایک تحریر 'لکھنؤ کی تاریخی عزاداری' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔
>
> (ایڈیٹر)

اتنا شغف تھا کہ وہ اس ایک ماہ اور بیس دن میں تاج شاہی زیب فرق کرنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ چونکہ بادشاہ کی تاج سے نسبت لازم وملزوم کی تھی اس لئے وہ ان ایام میں مور کے پروں کا بنا ہوا مخصوص تاج استعمال کرتے تھے۔ محرم اور عزاداری سے گرویدگی جو نصیرالدین حیدر کو تھی وہی ان کے بعد ان کے جانشینوں میں بھی برقرار رہی بلکہ ایک کے بعد دوسرے کے دورِ اقتدار میں یہ وابستگی بڑھتی ہی رہی۔ چنانچہ واجد علی شاہ کو محرم اور عزاداری سے اتنا انہماک تھا کہ وہ شب عاشور عوام کے گھروں میں جا کر تعزئے خانوں کی زیارت کرتے اور ہر مقام پر کچھ چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ ایک تو بادشاہ کا تشریف لانا اور دوسری طرف کچھ نہ کچھ مالی منفعت ہو جانا، اس طرزِ عمل کی وجہ سے لکھنؤ میں گھر گھر تعزیہ داری کا فروغ ہو گیا تھا۔ بعد انتزاع سلطنت لکھنؤ والوں نے سوگ نشینی کی مدت میں توسیع کر کے اس زمانے کو آٹھ ربیع الاول کی مدت تک بڑھا دیا تھا اور وہی چلن اب تک برقرار ہے۔ اس طرح لکھنؤ میں عزاداری کی میعاد اب دو ماہ آٹھ دن ہے۔

اودھ کے حکمراں فراخ دل اور وسیع النظر تھے۔ انہوں نے اگر ایک طرف تعزیہ داری کو فروغ دیا تھا تو اسی کے ساتھ مقامی تہواروں کو بھی اپنا لیا تھا۔ درباروں میں بڑے بڑے تزک و احتشام سے ہولی کھیلی جاتی تھی اور جوش وخروش سے بسنت منایا جاتا تھا۔ ان کی سرکار میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں طور پر سرپرستی ہوتی تھی۔ اسی روادارانہ اور منصفانہ حسن سلوک کی وجہ سے بھی لکھنؤ کی عزاداری کو جو پہلے ہی سے رائج تھی اور زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہر شہری محرم آتے ہی عزادار نظر آنے لگتا تھا۔ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد واجد علی شاہ سبز لباس پہن لیتے تھے اور اس کے بعد تمام ملازمین و متمسکین سیاہ پوش ہو جاتے تھے۔ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی۔ ہندو شعراء بھی مرثئے اور نوحے نظم کرتے تھے اور بعض ہندو تعزیہ دار اپنے تعزیوں کے ساتھ خود اپنا ہی تصنیف کردہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان باتوں کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ انتزاع سلطنت کے تخمیناً پچاس برس بعد اس میں کسی قسم کا کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارے شہر کا محرم اپنی آپ مثال تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ عزاداری کے سلسلے میں جتنے رسم و رواج لکھنؤ میں رائج تھے، ان کا عشر عشیر پر بھی کسی دوسرے ملک میں یہاں تک کہ کربلا میں بھی جہاں امام حسین کا مزار ہے، کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔

اسی مقام پر فرمانروایان اودھ اور ان مقبرین و متمسکین کے تعمیر کردہ مقدس مقامات کا مجملاً تذکرہ ضروری ہے کیونکہ انہیں قدیم یادگاروں نے لکھنؤ کی عزاداری کو سہارا دیا تھا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ میں اپنے لئے پہلے ایک امام باڑہ محلہ ٹھاکر گنج میں بنوایا تھا جو تعمیر ہو جانے کے بعد ان کو ناپسند ہوا۔ وہ امام باڑہ انہوں نے اپنے خواجہ سرا الماس میاں کو عنایت کر دیا تھا اور اب انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ پھر انہوں نے دوسرا امامباڑہ تعمیر کرایا جو اپنی رفعت وعظمت سے اپنا جواب نہیں رکھتا، بڑا امامباڑہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی میں آصف الدولہ کی آخری خواب گاہ ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی آرائش و زیبائش عدیم المثال تھی اور بہت قیمتی ساز وسامان موجود تھا۔ بہرحال اب بھی یہ ایک عظیم المرتبت شاہی یادگار ہے اور مراسم عزا کے سلسلہ میں اس کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسی عہد میں دو امامباڑے اور تعمیر ہوئے تھے جن میں ایک موسومہ کالا امامباڑہ محلہ پیر بخارا میں آصف الدولہ کی والدہ محترمہ بہو بیگم صاحب نے تعمیر کرایا تھا اور دوسرا محلہ ٹھاکر گنج میں وزیر خزانہ راجہ جھاؤلال نے بنوایا تھا جہاں اب سال میں ایک مخصوص تاریخ پر عشرہ منایا جاتا ہے۔ آصف الدولہ کے جانشین سعادت علی خاں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی لیکن ان کے بعد ان کے قائم مقام غازی الدین حیدر نے عدیم المثال عمارت شبیہ روضۂ حضرت علی بنوائی تھی جہاں وہ اور ان کی بیگم مدفون ہیں۔ یہ عمارت شاہ نجف کے نام سے موسوم ہے اور اس کے وسیع رقبہ میں بہت خوبصورت پارک میں لکھنؤ کی عزاداری میں اس تعمیر کا اہم مقام ہے۔ غازی الدین حیدر کے جانشین نصیرالدین حیدر نے ڈالی گنج یار کے ایک طویل وعریض علاقہ میں شبیہ کربلا بنوائی تھی۔ وہ اسی کربلا میں مدفون ہوئے اور اس کا نظم ونسق شاہ نجف اور حسین امام کے مشترکہ ٹرسٹ کے تحت چلایا جا رہا ہے۔

نصیرالدین حیدر کے جانشین محمد علی شاہ نے اپنی خوابگاہ کے لئے وہی امامباڑہ تعمیر کرایا تھا جو چھوٹا امامباڑہ کہلاتا ہے۔ یہ عمارت اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں اپنی مثال آپ ہے۔ امامباڑے کا ساز وسامان بھی قیمتی اور دیدہ زیب ہے اور اس کا انتظام بھی بڑی حد تک قابل اطمینان ہے۔ اخراجات کے لئے بادشاہ اپنی حیات ہی میں پورا پورا بندوبست کر گئے تھے۔ اسی سامان سے جو اس امامباڑے کی تعمیر سے بچ گیا تھا، عظیم اللہ خاں نے محلہ ٹھاکر گنج میں ایک کربلا تعمیر کرا دی تھی جو اب کربلائے عباس باغ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد علی شاہ کی ایک صاحب زادی نے اسی زمانہ میں ایک بلند و بالا امامباڑہ بنوایا تھا اور اس میں ایک ایسا منبر رکھوایا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس سے زیادہ اونچا منبر دنیا کے کسی کونے میں موجود نہیں تھا اور امامباڑہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حسین آباد کے امامباڑہ سے بہ لحاظ تعمیر زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ عمارت امام باڑہ مغل صاحب کے نام سے محلہ وزیر باغ میں موجود ہے۔ محمد علی شاہ کے اخلاف میں نواب سعید الدولہ نے تال کٹورہ کے قریب ایک کربلا بنوائی تھی اور ملکہ جہاں نے محلہ گولہ گنج میں ایک وسیع امامباڑہ بنوایا تھا۔ کربلا بہرحال بہتر حالت میں ہے لیکن امامباڑے کی زبوں

حالی قابل عبرت ہے۔اسی عہد میں محمد علی شاہ کے ایک مصاحب عظیم اللہ خاں نے ایک کربلا تال کٹورہ کے قریب اور ایک امامباڑہ حسین آباد کے نزدیک بنوایا تھا۔محمد علی شاہ کے جانشین امجد علی شاہ نے سبطین آباد کا علاقہ قائم کرکے اسی میں ایک رفیع الشان امامباڑہ بنوایا تھا جہاں وہ مدفون ہیں لیکن اس بڑے علاقہ کا جو حشر ہوا وہ ایک خونچکاں داستان ہے جس کا نہ بیان کرنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔امجد علی شاہ کی بیگم نے محلہ عیش باغ سے متصل ایک کربلا تعمیر کرائی تھی جو کربلائے ملکہ جہاں کے نام سے موسوم ہوئی۔کسی نہ کسی حال میں یہ کربلا اب تک برقرار ہے۔آخری تاجدار اودھ کو عزاداری سے بے پناہ شغف تھا لیکن ان کی آخری خواب گاہ لکھنؤ سے ہزارہا فرسخ دور مٹیا برج میں مقدر تھی پھر بھی انہوں نے ایک عزاخانہ قیصر باغ میں بنوایا تھا اور اس کا نام قصر البکا رکھا تھا جو اب سفید بارہ دری کے نام سے مشہور ہے۔

ان شاہی عمارات کے علاوہ رؤسا و عمائدین نیز علماء کے تعمیر کردہ امام باڑے بھی لکھنؤ میں اب بھی بکثرت موجود ہیں۔چنانچہ سبزی منڈی متصل وکٹوریہ اسٹریٹ کے کے عقب میں غفرانمآب سید دلدار علی اور چوک میں سید تقی صاحب کے امامباڑے عظیم تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔کٹرہ ابوتراب خاں میں نواب تجمل حسین خاں خلف خاں علامہ نواب تفضّل حسین خاں کا امامباڑہ سیکڑوں برس پرانی عظمت کی یادگار ہے۔وکٹوریہ اسٹریٹ پر ناظم صاحب کا امامباڑہ اپنی جلالت قدر کا اب بھی مالک ہے۔ناظم صاحب کا نام نامی آغا علی خاں تھا اور وہ دور شاہی میں منصب نظامت پر فائز تھے۔چاول والی گلی میں اکرام اللہ خاں کا امامباڑہ اپنی خستہ وخراب حالت کا ایک خاموش افسانہ ہے جہاں ایک زمانے میں مرثیہ خوانی کی بڑی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔مولوی گنج میں میاں داراب علی خاں اور گولہ گنج میں داروغہ واجد علی کے امامباڑے عظمت پارینہ کی یادگاریں ہیں۔ان میں ایک آغا باقر ایرانی النسل تھے جنہوں نے امامباڑہ غفرانمآب سے متصل مکان بنانے کے لئے اراضی خریدی تھی۔ان کو خواب میں ایک نہایت متبرک علم کی بشارت ہوئی جو زمین کھدوانے پر مل گیا۔انہوں نے اسی مقام پر امامباڑہ تعمیر کرایا اور وہ علم وہیں نصب کر دیا۔امامباڑہ انہیں کے نام سے موسوم ہے اور عقیدت مند ہر شب عاشور اس علم کی زیارت کرتے ہیں جو حقیقتاً ہیئت اور شکل میں اپنی آپ مثال ہے۔دوسرے سوداگر کا نام بھی باقر تھا اور وہ عموماً باقر سوداگر ہی کہلاتے تھے اور شیشہ آلات کی تجارت کرتے تھے۔ان کا تعمیر کردہ عظیم الشان امامباڑہ انہیں کے نام سے چوک کے قریب واقع ہے۔ان امامباڑوں کے علاوہ متعدد مزارات مقدسہ کی شبیہیں بھی لکھنؤ میں موجود ہیں مثلاً درگاہ حضرت عباسؑ، اسی سے متصل شبیہ نجف، محلہ کاظمین میں شبیہ کاظمین وغیرہ۔کاظمین کی عمارت بہت قدیم ہے اور کہا جاتا ہے کہ برادران ہنود میں کسی کائستھ نے عقیدتمندی سے یہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔سب سے زیادہ مرجعیت کربلائے تال کٹورہ کو حاصل تھی جہاں شیعہ اور سنی، ہندو اور مسلمان سب ہی روز عاشورہ اور روز اربعین اپنے اپنے تعزئے دفن کرتے تھے اور عقیدتمندوں کا اژدہام لگا رہتا تھا۔

لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں طوائفوں کو ایک مقام حاصل تھا چنانچہ ان کے بھی بہت سے امامباڑے تھے جن میں چودھرائن کا چوک میں امامباڑہ بڑی شہرت کا مالک تھا۔وہاں اب اصغر علی محمد علی تاجر عطر کا دفتر اور شوروم ہے۔اس کے علاوہ چاول والی گلی میں نجا اور اللہ بندی کے امامباڑے، پل غلام حسین پر حیدری اور عبدالعزیز روڈ پر کنیز کے امامباڑے خواص وعوام کی توجہ کے مرکز تھے۔حقیقت امر یہ ہے کہ اس شہر میں اتنے امامباڑے تھے جن کی تعداد و تفصیل بتانا امر محال ہے۔ہر طبقہ کے لوگ کسی نہ کسی امامباڑے سے متمسک تھے اور ہر رئیس کے گھر میں اسی کے نام سے موسوم امامباڑہ تھا۔اکثر و بیشتر امامباڑے اپنی نوعیت پر بھی باقی نہیں ہیں۔بہرحال جو کچھ تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ شہر لکھنؤ کے باشندوں کو محرم اور عزاداری سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ان حالات کا سلسلہ بیسویں صدی کے اوائل تک برقرار تھا۔

محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی سارا ماحول بدل جاتا تھا۔عورتیں اور مرد سب ہی سیاہ پوش ہو جاتے یا سبز لباس پہنتے تھے۔خواص وعوام سب کی مستورات چاند دیکھ کر فوراً تعزیہ خانے میں جا کر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کرتی تھیں اور سب زیور اتار دیتی تھیں۔یہ طریقۂ کار سوگ نشین ہونے کی پہلی منزل تھی۔بھرپور جوان اور تازہ بیاہی ہوئی عورتیں بھی زیورات اتار دیتیں اور چوڑیاں بڑھا دیتی تھیں۔بعض رؤسا کے گھروں میں جوان عورتوں کے ننگے کان اور ننگے ہاتھ رہنا گراں گزرتا تھا۔ان مستورات کو ہاتھوں میں کالے ڈورے میں چھوٹے موتیوں کے گندھے ہوئے لچھے اور ایسے ہی دُر کانوں میں پہن لینے کی اجازت رہتی تھی۔طلائی اور نقرئی زیورات ایام سوگ نشین میں، جس کی مدت روز اربعین یعنی ۲۰ رصفر کو ختم ہوتی تھی، پہننے کا قطعاً رواج نہیں تھا۔پان کھانا بھی یک لخت ختم ہو جاتا تھا۔

مرد عام طور سے امام کے سوم یعنی بارہ محرم کے بعد پان کھانے لگتے تھے لیکن عورتیں مکمل طور سے چالیس دن تک سوگ رکھتی تھیں۔پان کے بجائے کھوپرے یا سونف کا گوٹا استعمال ہوتا تھا۔رئیسوں کے یہاں چکنی ڈالی کھالی جاتی تھی۔محرم کے پہلے دس دنوں میں بعض خاندانوں کے یہاں بیماروں کا دوا علاج تک بند ہو جاتا تھا۔ایسے مریض اپنے عقیدے کی طاقت سے شفایاب ہوتے تھے۔ان کو اگر پلنگ پر لٹانا ناگریز ہوتا تو ان کے لئے مخصوص طور پر پلنگ

الٹا کر کے بچھا دیا جاتا تھا۔ صحت مند چالیس دن تک زمین کے فرش تک یا تختوں کے بستر پر سویا کرتے تھے۔ پلنگ اٹھ جاتے تھے یا مسہریاں ہٹا دی جاتی تھیں یا کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ باورچی خانوں میں مچھلی یا کسی اور ایسی چیز کے داخل ہونے کی ممانعت رہتی تھی جس کا مراسم خوشی سے کوئی ضمناً بھی تعلق ہو، اسی طرح کڑھائی چڑھنا یا کوئی چیز تلی جانا بھی ممنوع تھا۔ بعض خاندانوں میں بارہ دن تک نمک بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ بزرگوں اور سن رسیدہ لوگوں کا کیا ذکر بارہ روز تک بچوں کا بھی ہنسنا ممنوع رہتا تھا۔ وہ سہواً ہنس دیتے تو بزرگ فی الفور ملامت کرتے تھے۔ مسرت کی تقریبات کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ چالیس دن تک مسرت کا شائبہ بھی آنے نہیں پاتا تھا۔ ان تمام واقعات و حالات کا دقیقہ سنجی سے جائزہ لیا جائے تو یہ صورت حال فوراً سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس زمانہ میں عزاداران حسین واقعات کربلا کو آپ بیتی سمجھ کر اس طرح سوگ رکھتے اور روتے تھے جیسے کوئی اپنے عزیزوں کو روتا اور ان کا ماتم کرتا ہے۔ ان کے لئے غم، احساس غم اور اظہار غم تینوں کیفیات کا طاری ہونا ضروری تھا اور اظہار غم میں وہ تمام رسم و رواج شامل تھے جو اپنے گھر کی کسی میت کے بارے میں برتے جاتے تھے۔ چنانچہ جب روز عاشورہ گھروں سے دفن کرنے کے لئے تعزئے باہر نکالے جاتے تھے تو سر و پا برہنہ نوحہ پڑھتی اور ماتم کرتی ہوئی مستورات کے پیچھے ایک عورت لوٹے میں پانی بھرے چلتی اور امامباڑہ سے گھر کے صدر دروازے تک پانی انڈیلتی جاتی تھی۔ یہی طریقہ اپنے گھر کی میت کے ساتھ برتا جاتا تھا۔

محرم کی پہلی تین تاریخوں میں مجالس کے علاہو امامباڑوں کی آرائش و زیبائش، روشنی اور ان کو معطر کرنے کی بھی فکر رہتی تھی۔ رئیسوں اور امیروں کے یہاں بڑے بڑے نہایت رنگین وخوب صورت لیمپ میٹ کے تیل سے روشن کئے جاتے تھے اور جھاڑوں، ڈالوں اور شیشہ کی لٹکی ہوئی لالٹینوں میں رنگین اور سفید شمعیں جلائی جاتی تھیں۔ آرائش و زیبائش کے لئے دیواروں پر کتبے آویزاں کئے جاتے تھے۔ رئیسوں کے یہاں یہ کتبے قیمتی مخطوطے آویزاں کئے جاتے تھے جن پر ائمہ کی منقبت میں اشعار یا آیات قرآنی خط نسخ و نستعلیق میں لکھے ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ تیسری تاریخ تک ہر عزادار اپنے معیار کے مطابق اور اپنی مقدرت کے بموجب اپنے گھر کے عزاخانہ کو آراستہ پیراستہ کر دیتا تھا اور حسن و جمال کے تمام لوازمات کی تکمیل حسب مراد کر لیتا تھا۔ شاہی امامباڑوں میں یہ جملہ انتظامات یکم محرم ہی کو مکمل ہو جاتے تھے اور اب بھی مکمل ہو جاتے ہیں۔

خواص و عوام کے امامباڑوں میں چوتھی محرم لغایت چھٹی محرم کو مراسم عزا بجالانے کے علاوہ بچوں کی منتیں پوری ہوتی تھیں اور ان کے لئے مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ عزاداری اور غم حسین میں آہ و زاری سے اتنی گرویدگی تھی کہ وہ لوگ بچوں کے حق میں دعائیں کرنے اور ان کے طول عمر و ترقی درجات کے لئے مرادیں مانگنے میں بھی شہدائے کربلا کی یاد کو اپنا وسیلہ بناتے تھے۔ ان تاریخوں میں اپنے اپنے خاندانی دستور کے تحت کسی ایک روز بچوں کو امامباڑے میں گروی کیا جاتا تھا، منت کا ناڑہ گلے میں ڈالا جاتا تھا اور منت کے کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ یہ کپڑے بیحد سادہ، سستے اور کالے رنگ کے ہوتے تھے۔ سبز رنگ کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ یہ رنگ آل رسول سے منسوب ہے۔ پانچویں محرم کو بچے درحسین کے فقیر بنائے جاتے تھے۔ گلے میں جھولی ڈال کر حاضرین سے بھیک مانگتے تھے جو رقم وصول ہوتی غربا و مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہ رسم غالباً اس یاد دلانے کے لئے رائج تھی کہ حسین کے بچے ایک ایک دانۂ خوراک اور ایک ایک قطرۂ آب سے محروم رکھے گئے تھے۔ ان تمام رسموں میں سب سے زیادہ اسیر بنانے کی رسم تھی جو کہیں پانچویں اور کہیں چھٹی محرم کو انجام دی جاتی تھی۔ بچوں کے گلے میں طوق یا پیروں میں بیڑی اور کہیں طوق اور بیڑی دونوں ڈال کر اسیر کیا جاتا تھا اور اسیری کی یہ علامت چہلم کے دن تک برقرار رکھی جاتی تھی۔ یہ منتیں ہر سال ہوتی تھیں اور ان کو بڑھانے کی مدت کا تعین بچوں کی عمر کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہر خاندان کا اپنا اپنا علیحدہ دستور تھا۔ کہیں بچے کے پانچ برس، کہیں دس برس، کہیں پندرہ برس اور کہیں اس سے بھی زیادہ عمر پا جانے کے بعد یہ منت بڑھائی جاتی تھی۔ میرے ایک دوست جو کیننگ کالج میں میرے ہم درس تھے، اسیر

لکھنؤ کے چھٹے نواب سعادت علی خاں کے مقبرہ پر محرم میں لگنے والی سبیل کا ایک منظر

بنتے تھے اور بی اے پاس کرنے کے بعد ان کی منت بڑھائی گئی تھی۔ اب ان منتوں اور مرادوں کا رواں بہت کم ہو گیا ہے لیکن پچاس برس قبل تک یہ تمام مراسم پوری توجہ کا مرکز تھے۔

انہیں مراسم میں ایک بڑی لطیف رسم بھی تھی جو آٹھویں محرم کو ادا ہوتی تھی۔ اس روز دودھ اور شربت پر حضرت عباس کی نذر دلائی جاتی تھی۔ حضرت عباس میدان جنگ میں اپنی بھتیجی یعنی امام حسین کی پیاسی صاحب زادی کے لئے پانی لینے گئے تھے اور ان کے ہمراہ مشک تھی۔ وہ پانی نہیں لا سکے اور شہید کر دئے گئے۔ انہیں کی یاد میں یہ رسم ادا ہوتی تھی۔ نذر دیا ہوا دودھ یا شربت ایک چھوٹی مشک میں بھر دیا جاتا تھا اور وہ مشک بچے کے کاندھے پر رکھ کر اس کو بہشتی بنایا جاتا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کٹورہ رہتا تھا جس میں تھوڑا تھوڑا دودھ شربت انڈیل کر وہ حاضرین کو پلاتا تھا۔ یہ رسم بھی بچہ کی عمر میں مدت معینہ ختم ہو جانے پر بڑھا دی جاتی تھی۔ ہر رسم بڑھائی کے موقع پر خصوصی طور پر مجلس ہوتی اور تبرک فراخ دلی سے تقسیم کیا جاتا تھا۔

محرم کی ساتویں تاریخ قاسم ابن الحسن کی یاد کے لئے ہمیشہ مخصوص رہی ہے۔ قاسم کی عمر روز عاشورہ نو برس کی بتائی گئی ہے، وہ امام حسن کے بیٹے اور امام حسین کے بھتیجے تھے۔ بعض مستند روایات کے بموجب امام حسین نے اپنے بڑے بھائی کی وصیت پوری کرنے کے لئے اپنے بھتیجے کا عقد اپنی صاحبزادی سے شب عاشور کر دیا تھا۔ ان حالات میں اور جناب قاسم کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ساتویں محرم کو ان کا غم بڑے زور وشور سے منایا جاتا تھا اور ان کی عروسی کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک بڑے ظروف اور ایک سے زیادہ سینیوں میں پسی ہوئی مہندی بھری جاتی تھی اور اسی کے اوپر بڑی بڑی توغیں روشن کی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی دودھ اور ملیدے پر حضرت قاسم کی نذر ہوتی تھی۔ بعض خاندانوں میں اسی شب کو یا دن میں امام حسین کے گھوڑے ذوالجناح کی شبیہ بعد ختم مجلس امامباڑے میں پیش ہوتی تھی جس کے باعث گریہ وبکا میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ دودھ اور ملیدہ اس گھوڑے کو کھلایا جاتا اور اسی برتن سے بعض لوگ عقیدتاً تھوڑا تھوڑا تبرک حاصل کر لیتے تھے۔ لگن میں جو دودھ ملیدہ بچ رہتا وہ اسی شبیہ ذوالجناح کے ہمراہ کر دیا جاتا تھا۔ حسین آباد مبارک میں مستقل طور پر ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا پلا رہتا تھا اور اب بھی پلا ہے جس کو صرف شبیہ ذوالجناح بنانے کے کام میں لایا جاتا رہا ہے۔

ساتویں محرم کی طرح آٹھویں تاریخ بھی ایک ہی شہید کی یاد کے لئے ہمیشہ مخصوص رہی ہے۔ یہ شہید حضرت عباس علمبردار تھے۔ حضرت عباس امام حسین کے مختلف البطن چھوٹے بھائی تھے۔ آپ ہمیشہ امام حسین کے پروانہ وار شیدائی رہے تھے اور بیحد وفا شعار تھے۔ آپ کی شجاعت بھی ضرب المثل تھی۔ روز عاشورہ امام حسین نے ان کو اپنی فوج کا علم دے کر سپہ سالار لشکر مقرر کر دیا تھا۔ میدان جناب میں آپ کی روانگی بھی مخصوص طرز کی تھی۔ اپنی بھتیجی سے پانی لانے کا وعدہ کر کے اس سے ایک مشک منگا کر اپنے علم میں باندھ لی تھی۔ لڑائی لڑتے ہوئے دریائے فرات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور مشک میں پانی بھر لیا تھا لیکن وہ پانی اہل حرم کے خیمہ تک نہیں پہنچ سکا اور آپ کی شہادت دریا کے کنارے ہی واقع ہو گئی تھی۔ ان تمام واقعات کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضرت عباس کے نام کا علم بھی مخصوص طرز کا ہوتا ہے۔ ہر امامباڑے میں یہ علم سب سے علیٰحدہ اور تمام دوسرے علموں کے مقابلہ میں بلند تر اور ایک طویل چھڑ پر نصب رہتا ہے۔ چھڑ کے اوپر ایک کپڑے کی بنی ہوئی مشک بھی آویزاں رہتی ہے۔ اس علم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ بڑے سے بڑے رئیس کے گھر میں یہ علم ہمیشہ تانبے کا رہا ہے اور اس کا پٹکا بھی برابر سادہ ہی بنتا رہا ہے لیکن اس علم کی عظمت کا احساس ہر عزادار کے دل میں ہیبت کی حد تک طاری رہا ہے۔

آٹھویں محرم کو دن گزر کے شام کے وقت ایک زمانہ میں بہت بڑے پیمانے پر حضرت عباس کی حاضری ہوتی تھی۔ بہترین بڑی بڑی نفیس شیرمالوں پر کباب مسالہ اور پنیر رکھ کر بڑی قاب میں حضرت عباس کی نذر انہیں سے منسوب علم کے نیچے ہوا کرتی تھی، جو حاضری کہلاتی تھی، اسی شیرمال اور کباب کے بے شمار حصے لوگوں کے گھروں پر دن ہی میں تقسیم ہو جایا کرتے تھے۔ رات کو آنے والے طہارت وعقیدت کے ساتھ علم کے نیچے حاضری چکھتے تھے۔ یہ حاضری ہر امامباڑے میں آٹھویں محرم کو اب بھی ہوتی ہے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسم پوری کر دی جاتی ہے۔ خصوصیت واہمیت ختم ہو گئی۔ لکھنؤ والوں نے شیرمال کو حضرت عباس کے نام سے کچھ ایسا منسلک کر دیا تھا کہ اس روز بکثرت حصے شیرمال ہی کے تقسیم ہوتے تھے۔ اصل شیرمال جو خوشبو، رنگ اور ذائقہ کی حامل تھی، تقریباً پچاس برس سے مفقود ہے۔

نویں محرم کا دن گریہ وبکا کے لئے مخصوص تھا اور جب دن گزر کر رات آتی تو پرانے لکھنؤ میں ہلچل مچ جاتی تھی۔ ہر شیعہ کا گھر نو دن قبل ہی سے عزاخانہ رہتا تھا۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں محرم کی چھٹی سے تعزئے آنے لگتے تھے۔ اہل ہنود بھی شب عاشور بکثرت تعزئے دار ہو جاتے، وہ خود مرثئے پڑھتے یا پڑھواتے، ہندو اور مسلمان عورتیں جھنڈ بنا کر بیٹھتی تھیں اور بڑے درد انگیز لہجے میں 'دہے' گاتی تھیں۔ عام مسلمانوں میں ڈھول تاشے بجانے والوں کے بھی دستے تھے۔ یہ لوگ تعزیوں کے آگے ڈھول تاشے بجا کر واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرتے تھے۔ ان آوازوں کے ساتھ سینہ زنی اور گریہ وبکا کی صدائیں زمین و آسمان کو متاثر کرتی تھیں۔ ہر گلی کوچہ میں رات بھر آمد و رفت رہتی تھی۔ بلا تفریق مذہب وملت اور بلا امتیاز

مدراج و آئین ہر شخص کو امامباڑوں کی زیارت کی آزادی رہتی تھی۔ ہر امامباڑے میں شب عاشور آرائش وزیبائش دوبالا ہوجاتی تھی اور روشنی کا اہتمام تکمیل تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ شاہی امامباڑوں میں آٹھویں اورنویں دونوں تاریخوں میں زبردست روشنی ہوتی تھی لیکن شب عاشور ہر شہری کو زیارت کے لئے اذن عام ہوتا تھا۔ ان امامباڑوں میں سونے چاندی کے علموں کی چمک کارچوبی اور زربفتی پٹکوں کی دمک اور بلور کی طرح شفاف جھاڑوں اور فانوسوں سے چھنتی ہوئی روشنی اور ہر طرف بے پناہ روشنی کو دیکھ کر آنکھوں میں چکاچوند ہونے لگتی تھی۔ اس شب میں خواص وعوام بھی اپنے اپنے عزاخانوں اور تعزیہ خانوں میں زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کرتے تھے۔ اس زمانے میں برقی روشنی نہیں تھی لیکن اس سے بہتر طریقہ پر جھاڑ، فانوس، یک ڈالہ، دو ڈالے، مردنگ، شمع دان اور شیشہ کے رنگ برنگے لیمپ اپنے حسین و خوب صورت گلوبوں سمیت روشن ہوکر تجلی اور نور برساتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کافوری شمعوں اور رنگین چھوٹی بڑی طوغوں کی روشنی بہت بھلی لگتی تھی۔ (طوغیں بڑی بڑی رنگین شمعیں ہوتی تھیں جن پر روپہلی یا سنہری کاغذ کی پٹیاں خوب صورتی کے لئے لہریا انداز میں لگی ہوتی تھیں لیکن مخصوص موقعوں پر خوش نمائی اور رنگین روشنی کے لئے بھی استعمال ہوتی تھیں۔) لیکن ان تمام آرائش و زیبائش اور تجلی و نورانیت کے باوجود کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر وہ شخص جو گھر سے باہر نکلتا تھا اپنے کسی عزیز وقریب کی میت کو کاندھا دینے جارہا تھا۔ اہالیان لکھنؤ بالعموم یہ سمجھا کرتے تھے کہ امام حسین پہلی محرم سے انہیں کے یہاں مہمان تھے اور اب ان کو رخصت کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ شب عاشور ان کے تصور میں شب رخصت امام تھی۔ اس لئے ان کے نوحہ وبکا اور ان کے ڈھول تاشوں سے بھی ہائے ہائے امام کے تاثرات دلوں پر پیدا ہوتے تھے۔

روز عاشورہ طلوع آفتاب کے بعد ہی سے تعزئے اٹھنے کی گہما گہمی شروع ہوجاتی تھی۔ جہاں سے تعزیہ نکلتا، یہ معلوم ہوتا کہ بھرے گھر سے جنازہ نکل رہا ہے اور اس جنازہ کو عزیز واقارب دھوم سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ مرنے کے بعد میت سے متعلق قریب قریب تمام ہندو اور مسلمان رسموں پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ اس عملدرآمد میں اجتماعی شان اور زیادہ اثر پیدا کر دیتی تھی۔ ہر تعزیہ دار اپنا تعزیہ اٹھانے کا وقت خود مقرر کرتا تھا اور سارے انتظامات خود ہی کرتا تھا۔ عمال حکومت کو ان معاملات میں بہت کم دخل تھا۔ سب تعزیوں کے لئے نخاس تک پہنچ جانے کے بعد صرف ایک راستہ اور ایک قبرستان تھا۔ تال کٹورہ کی کربلا، جہاں سب تعزئے دفن ہوتے تھے، تعزیوں کے ساتھ ساتھ علیٰحدہ علیٰحدہ مجمع رہا کرتا تھا۔ یہ علیٰحدگی اپنے اپنے ذوق ومذاق کے تحت ہوجاتی تھی۔ کیونکہ کہیں نوحہ خوانی ہوتی تو کہیں سوزخوانی اور کہیں صرف ماتم ہوتا یا گریہ وبکا کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ زائرین وسامعین اپنے اپنے شوق کی آسودگی کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ ٹولیوں میں منقسم نظر آتے تھے۔ اس بظاہر علیٰحدگی اور بباطن اشتراک میں اکھاڑے بھی چلتے تھے لیکن ان کے ڈھول تاشوں کی آوازوں یا پھری گتکوں کی ورزشوں سے رونے والوں کیک گریہ و بکا میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا اور نہ ان سوگواروں نے ان مظاہروں کو خلاف شرع دے کر کبھی کوئی تعرض کیا۔

لکھنؤ میں ۱۰ر صفر کو آصفی امامباڑے میں ہونے والے بہتر تابوت کا ایک منظر

بہرحال لوگ جوق در جوق تعزیوں کی زیارت کرتے اور اچھے سے اچھے مرثئے اور نوحے سنتے تھے۔ اس زمانہ کی نوحہ خوانی میں ترنم ضرور تھا لیکن موسیقی نہیں۔ اسی طرح ماتم ہوتا تھا مگر نہ نپے تلے ہاتھ چلتے تھے اور نہ ڈیوڑھ ہوتی تھی۔ انہیں نوحہ خوانوں میں طوائفیں بھی تھیں جو اپنے اپنے تعزیوں کے ساتھ خود ہی خوانندگی کرتی تھیں۔ ایسے تعزیوں میں حیدر جان، بدر منیر، مہر منیر (یہ دونوں بہنیں چودھرائن تھیں) ببن، مغل جان، نجا وغیرہم کے تعزئے بڑی شہرت، عظمت اور قوت کے مالک تھے جن میں رؤسا، شرفا اور عوام شرکت کرتے تھے اور خاموش تماشائیوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اتنے بڑے اجتماع میں نہ لوگ ایک دوسرے سے بلاضرورت گفتگو کرتے تھے اور نہ چہروں پر مسکراہٹ آتی تھی۔ شب عاشور کے جاگے سارا دن حزن و ملال میں گزارتے تھے۔ ان میں بیمار بھی فاقہ ضرور کرتے البتہ مجبوراً پانی پی لیتے تھے۔

ہندو تعزیہ داروں میں ایک عجیب قسم کی رسم رائج تھی۔ کچھ لوگ شب عاشور 'پیک' بنتے تھے۔ ان کو

کوئی 'پائک' اور کوئی 'نائک' کہتا تھا۔ ان کا انتہائی نامانوس لباس ہوتا تھا۔ سر پر پگڑی مگر عام پگڑی سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ سر پر کپڑے کے تھان کو پیچ در پیچ لپیٹ کر اوپر ایک اونچی سی نوک نکال لیتے تھے۔ کمر میں پٹکا بندھا ہوتا تھا اور درجنوں چھوٹی موٹی گھنٹیاں لٹکائے رہتے تھے جو ذرا سی حرکت میں ٹن ٹن بولنے لگتی تھیں۔ پیک کے ہاتھ میں مرچھل رہتی تھی اور یہ آدمی روز عاشورہ نکل پڑتا تھا اور برابر حرکت میں رہتا تھا۔ ہر وقت ادھر سے ادھر دوڑتا۔ اس تعزئے سے اس تعزئے کے قریب جاتا۔ اس مجمع سے مل کر برابر حرکت دیتا رہتا اور یہ حرکت بھی تیز تیز اور زور سے ہوتی تھی۔ یہ شخص نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کسی نوحہ خوانی یا ماتم زنی میں کوئی حصہ لیتا تھا اور نہ ہی اس کی زبان سے روزمرہ کی گفتگو کا کوئی کلمہ نکلتا تھا۔ وہ خاموش رہتا تھا لیکن ادھر سے ادھر جا کر ہر گوشہ، ہر مجمع اور ہر موقع و محل سے کہہ اٹھتا تھا کہ 'حسین کشتہ شد' اس ایک فقرہ کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا فقرہ یا لفظ کسی 'پیک' کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ شخص قاصد بن کر قتل حسین کی خبر مزار رسول، تربت علی، مرقد فاطمہ اور تمام دیندار انسانوں کے کانوں تک پہنچاتا تھا۔ پیک کس ذات یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ تخمیناً پچاس برسوں سے یہ رواج بھی ختم ہو چکا ہے۔

شیعہ مسلمان عام طور سے کوئی دنیاوی کام روزِ عاشورہ نہیں کرتے تھے۔ دن بھر فاقہ کرتے، پیاسے رہتے اور ڈلی تمباکو تک نہیں کھاتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ سر و پا برہنہ گھروں سے نکل کر اپنے تعزیوں کے ساتھ یا دوسرے تعزیوں کی رستہ میں زیارت کرتے ہوئے کربلا پہنچ جاتے تھے اور اعمال عاشورہ کر کے سارا وقت حزن و ملال میں صرف کرتے تھے۔ دوسرے شہری بھی سویرے ہی گھروں سے نکل آتے اور دن بھر تعزیوں کی زیارت کرتے تھے۔ صبح سے سہ پہر تک راستوں، سڑکوں اور گلیوں میں مجمع لگا رہتا تھا۔ کربلا میں خصوصیت کے ساتھ اژدہام ہوتا تھا۔ برادران اہل سنت اور ہنود باقاعدہ فاقہ نہیں کرتے تھے لیکن دن بھر گھر واپس جانے کی کسی کو فرصت نہیں ملتی تھی۔ کربلا میں نیز راستوں پر اشیائے خوردنی کی دکانیں لگ جاتی تھیں۔ ان دکانوں نیز کربلا کے باہر میدانوں میں رؤسا و عمائدین کی چھول داریوں کی وجہ سے میلے کی شان ضرور پیدا ہو جاتی تھی اور بعض غیر شیعہ حضرات نیز ان کے ہمراہ چھوٹے بچے کچھ کھا کر پانی پیتے تھے۔ عام مسلمانوں اور ہندو صاحبان روزِ عاشورہ کربلا میں پانی کی سبیلیں بھی رکھتے تھے لیکن روزِ عاشورہ زیادہ تر لوگ بالاعلان کھانے پینے سے اجتناب کرتے تھے۔ دوپہر کے بعد کربلا سے واپسی ہوتی تھی تاکہ عصر کے وقت تک سب تعزیہ دار اور سوگوار اپنے اپنے عزاخانوں اور گھروں تک پہنچ جائیں۔ عصر کے بعد یعنی غروب آفتاب سے دو تین گھنٹے قبل فاقہ شکنی کا وقت آجاتا ہے۔

عمائدین و شہزادگان اور جلیل المرتبت رؤسا روز عاشورہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ وہ اپنی محل سراؤں میں کسی تنہائی کے مقام پر سارا دن گزارتے تھے البتہ فاقہ شکنی کے وقت اپنے اپنے امامباڑوں میں اپنے متعلقین اور ملازمین کی فاقہ شکنی کراتے اور کھانے کھلاتے تھے۔ اس زمانہ میں ہر کھانا خوش ذائقہ اور خوش رنگ پکتا تھا اور انواع و اقسام کی غذائیں موجود رہتی تھیں لیکن اس دن یہ خیال ملحوظ رہتا تھا کہ غذائیں سادہ اور بے کیف ہوں، اس لئے رئیسوں کے دسترخوان پر صرف باقرخوانی، سالن کباب اور دال چاول پر اکتفا کی جاتی تھی۔ یہ خیال بہرحال رکھا جاتا تھا کہ رنگ و خوشبو کے لوازمات سے اس روز کے کھانوں کو محروم رکھا جائے اور کوئی چیز دسترخوان پر شیرینی کی قسم سے نہ آنے پائے۔ جن مخصوص چیزوں پر امام کی نذر ہوتی وہ نان جویں اور ساگ نیز دودھ شربت ہوتی تھیں۔ نذر کی پلیٹ رئیس کے سامنے رکھی جاتی اور وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسروں کو تھوڑا تھوڑا تبرک پہلے چکھا دیتے تھے پھر کھانا شروع ہوتا تھا۔ ممتاز اور مشہور امامباڑوں میں بھی سادہ پلاؤ سے فاقہ شکنی کرائی جاتی تھی۔ البتہ شرفا اور عوام کے گھروں میں 'ست نجے' سے فاقہ توڑا جاتا تھا۔ یہ غذا سات قسم کے اجناس کو بھون کر تیار ہوتی تھی جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتی تھی کہ بعد قتل حسین خیموں میں آگ لگا دی گئی تھی اور اجناس کی قسم سے جو کچھ بھی تھا سب بھن گیا تھا۔ ست نجے کے ساتھ اصل غذا کھڑے مسور کی دال اور چاول ہوتے تھے۔ بعض خاندانوں میں ماش کی دال اور چاول کا رواج تھا۔ یہی غذا اب تک رائج ہے اور باقی سب لوازمات دسترخوان اور فاقہ شکنی کے ختم ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ست نجا اب بھی کہیں کہیں تیار ہوتا ہو۔ ستر برس قبل شہر لکھنؤ میں سوگ نشینی اور حزن و ملال کا زمانہ یکم محرم سے شروع ہو کر یوم اربعین کو ختم ہو جاتا تھا۔ اس میعاد کی ابتدا حقیقی معنوں میں حسین آباد کی ضریح اٹھنے کے وقت سے شروع ہوتی تھی اور کربلائے تال کٹورہ میں 'کالا تعزیہ' پہنچ جانے پر ختم ہو جاتی تھی۔

آخر دور میں نواب پتن صاحب کا تعزیہ سب سے آخر میں پہنچنے لگا تھا۔ اربعین کا دن گزر جانے کے بعد مستورات و بیگمات سوگ بڑھا دیتی تھیں۔ پلنگوں پر لیٹنا شروع ہو جاتا تھا اور باورچی خانوں میں کڑھائی چڑھنے لگتی تھی۔ مردوں اور عورتوں میں پان کھانا شروع ہو جاتا تھا۔ چہلم کے بعد پھر کوئی تعزیہ نہیں اٹھتا تھا۔ البتہ ۸ ربیع الاول کو چپ تعزیہ اٹھتا تھا جو وکٹوریہ اسٹریٹ سے اٹھ کے گول دروازہ، چوک، اکبری دروازہ، پل غلام حسین ہوتا ہوا روضۂ کاظمین تک جاتا تھا۔ بہت بعد میں ایام عزا کی میعاد بڑھا کر ۸ ربیع الاول تک بڑھا دی گئی جو اب تک برقرار ہے لیکن تال کٹورہ کی کربلا اور روز اربعین کو جو مرجعیت اور تاریخی اہمیت حاصل تھی وہ حالات بدلنے کے بعد بھی برقرار رہی تھیا وراب بھی قابل لحاظ ہے کیونکہ عزاداری کے

سلسلہ میں بلاتفریق مذہب وملت خواص وعوام میں جو مرجعیت اور مقبولیت تال کٹورہ کی کربلا کو حاصل تھی وہ کبھی کسی دوسرے مقام کو میسر نہیں ہوئی۔

کربلائے تال کٹورہ میں اربعین کو جو اجتماع ہوتا تھا اس کی نوعیت روز عاشورہ سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ اول تو یہ سوگ نشینی کا آخری دن ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس روز کوئی فاقہ سے نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے طرح طرح کے اہتمام بھی رہا کرتے تھے۔ نخاس سے کربلا تک شیعوں کے علاوہ برادران ہنود واسلام بہ کثرت سبیلیں رکھتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت و برف اور بعض ذی حیثیت ہلکی چیزوں مثلاً نارنگی یا سنگترہ سے بھی سوگ نشینوں اور ماتم کرنے والوں کی تواضع کرتے تھے۔ ان تواضع کرنے والوں میں راجہ امام بخش کی دریا دلی عدیم المثال تھی۔ کربلا کے بہت پہلے ہی سے اشیائے خورد ونوش کی دکانیں لگی رہتی تھیں جن کی تعداد کربلا سے متصل سیکڑوں تک ہو جایا کرتی تھی۔ صدر پھاٹک کے ایک جانب بیرونی میدانوں میں مقتدر رؤسا و عمائدین اور ڈیرے دار طوائفوں کی چھول داریاں نصب ہوتی تھیں اور اسی کے عین مقابل مقامی حکام بالا کے لئے خیمہ لگتا تھا جہاں بعض رؤسا ان کی شربت وغیرہ سے خاطر کرتے تھے۔ اربعین کے دن بھی کربلا میں بے شمار علم اور تعزئے آتے تھے لیکن سینہ زنی اور مرثیہ خوانی عشرہ کے مقابلہ میں زیادہ جوش وخروش سے ہوتی تھی۔ مجمع کا اژدہام بھی اس روز شام تک لگا رہتا تھا۔ لوگ کشمیریوں کے علم اور دو مخصوص تعزیوں کے منتظر رہا کرتے تھے اور یہی علم و تعزئے آخر میں آتے تھے۔ علم بیحد متبرک، محترم اور مقبول سمجھا جاتا تھا۔ محلہ گولہ گنج میں واقعہ مقبرۂ عالیہ سے اٹھ کر چہلم کے دن کربلا آتا تھا۔ یہ علم ادب بھی برقرار ہے لیکن اپنے پرانے اقتدار و احترام کا مالک نہیں رہا۔ تعزیوں میں ایک گراں قدر یادگار نواب ممتاز الدولہ بہادر کی تھی۔ ان کے صاحبزادے نواب باقر علی خاں متولی حسین آباد تعزئے کو شاہی جلوس سمیت اٹھاتے تھے اور یہی صورت حال اس تعزیہ کی اہمیت کا باعث تھی۔ دوسرا اور سب سے زیادہ ممتاز، باشکوہ اور مرجع خاص و عام وہ تعزیہ تھا جو نواب پٹن صاحب کا تعزیہ کہلاتا تھا جس کے لئے یہاں پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ موجودہ دور میں اس تعزیہ کی عظمت و جبروت کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس کی زیارت کو بہت دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے اور حقیقت امر تو یہ ہے کہ اس کے بند ہو جانے کے بعد لکھنؤ کے چہلم کی

کربلائے تال کٹورہ میں اربعین کو جو اجتماع ہوتا تھا اس کی نوعیت روز عاشورہ سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ اول تو یہ سوگ نشینی کا آخری دن ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس روز کوئی فاقہ سے نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے طرح طرح کے اہتمام بھی رہا کرتے تھے۔ نخاس سے کربلا تک شیعوں کے علاوہ برادران ہنود واسلام بہ کثرت سبیلیں رکھتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت و برف اور بعض ذی حیثیت ہلکی چیزوں مثلاً نارنگی یا سنگترہ سے بھی سوگ نشینوں اور ماتم کرنے والوں کی تواضع کرتے تھے۔ ان تواضع کرنے والوں میں راجہ امام بخش کی دریا دلی عدیم المثال تھی۔

شان وشوکت اور آب وتاب ختم ہوگئی۔

اسی سلسلہ میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ روز عاشورہ اور روز اربعین تال کٹورہ کی کربلا میں جم غفیر لگے رہنے کے یہ معنی نہ تھے کہ شہر کے تمام امامباڑے سونے پڑے رہتے تھے یا یہ کہ دوسری کربلائیں بند رہتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا، امامباڑوں میں اپنے اپنے وقت سے مجلسیں ہو جاتی تھیں اور علم یا تعزئے جو اٹھنا ہوتے اٹھ جاتے پھر ان کو حسب معمول بند کر دیا جاتا تھا۔ تعزئے کربلاؤں میں دفن ہوتے تھے۔ ہر کربلا اپنے تعمیر کرنے والے کے نام سے موسوم تھی۔ اسی خاندان کے لوگ اپنے اپنے تعزئے روز عاشورہ اور روز اربعین اپنی کربلاؤں میں دفن کر دیتے تھے اور اس کے بعد اجتماعی عزاداری میں شرکت کی غرض سے تال کٹورہ کی کربلا چلے آتے تھے۔ رؤسا و عمائدین، شرفا و عوام سب کا بلاتفریق مذہب وملت اسی کربلا میں مجمع ہوتا تھا۔ اہل سنت اور برادران ہنود ان سب کے تعزئے صرف اسی کربلا میں آتے تھے۔ یہ خصوصیت اس کربلا کو کئی وجوہ کی بنا پر حاصل تھی۔ یہ مقدس مقام وکٹوریہ اسٹریٹ کے بالکل اختتام پر واقع تھا اور ہماری پرانی آبادی کا بہت بڑا حصہ اسی سڑ کے دونوں جانب آباد تھا۔ اس طرح وکٹوریہ اسٹریٹ کی پوری مسافت طے کرنا عزاداروں کے لئے ترویج عزا کا بہترین وسیلہ تھا۔ دوسرے یہ کہ برادران اہل سنت و ہنود کے پاس اپنے اپنے تعزئے دفن کرنے کے لئے کوئی مخصوص کربلا نہیں تھی۔ تال کٹورہ کی کربلا کا بانی کوئی بادشاہ نہیں تھا اور نہ یہ املاک کسی رئیس کی ملکیت تھی۔ عوام الناس میں سے کچھ لوگوں نے اس کربلا کی تعمیر کرائی تھی اور ابتدا ہی سے عوام کو تعزئے دفن کرنے اور اپنے عزیزوں کی تدفین کے لئے بھی آسانی اور آزادی حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ رؤسا و معززین شہر میں بہت سے مرنے والے اسی کربلا میں دفن ہوئے تھے اور اس مقام کو اتنی عظمت حاصل ہوگئی تھی کہ یہاں دفن کیا جانا باعث مغفرت سمجھا جانے لگا تھا۔ ان مرحومین کے اعزا و اقارب کو روز عاشورہ اور روز اربعین اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اموات اور تعزئے دفن کرنے کے لئے وسیع آراضی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تال کٹورہ کی کربلا بہت بڑے رقبہ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کا احاطہ اتنا وسیع تھا اور ہے کہ لکھنؤ کا بڑے سے بڑا مجمع باہر سے آنے والے بے شمار افراد سمیت یہاں اکٹھا ہو سکتا تھا اور ہوا۔

❑❑❑

شاہی تہذیب عزا کا شہر لکھنؤ

نواب جعفر میر عبداللہ
شیش محل، حسین آباد لکھنؤ
موبائل:

لکھنؤ عزاداری کا مرکز ہے۔ چونکہ یہاں نوابین اودھ، بیگمات اودھ، شاہان اودھ اور روسا، نے امامباڑے تعمیر کروائے اور عزاداری کی بنیاد رکھی جسمیں آصفی امامباڑہ دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ آصفی امامباڑے میں جو آصفی مسجد ہے۔ پہلے اس کی تعمیر ہوئی نواب آصف الدولہ اپنے مصاحبین کے ساتھ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ان کے مصاحبین نے کہا کہ کاش اس مسجد کی شایان ایک امامباڑہ بھی اس سے ملحق ہوتا تو کیا خوب تھا۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے فرمان جاری کیا کہ امامباڑے کے لئے نقشہ تیار کیا جائے، جسے حافظ کفایت اللہ جو ایرانی نسل کے تھے اس امامباڑے کا نقشہ تیار کیا جسے نواب صاحب نے پسند کیا۔ لیکن اس نقشے میں ایک قباحت یہ تھی کہ ایک مقام پر ایک ضعیفہ جن کو ''لاڈو ساکھن'' کہتے تھے، ان کی کھپریل تھی لہذا یہ جگہ اس نقشہ میں شامل ہونا ضروری تھی ورنہ نقشے میں ''کان'' رہ جاتا۔

نواب آصف الدولہ نے اپنے اہلکار کے ذریعہ ''لاڈو ساکھن'' سے اس جگہ کو چھوڑنے کی گزارش کی اور اس کے عوض وہ جو چاہیں جہاں چاہیں اور جتنا چاہیں آراضی لے لیں۔ ''لاڈو ساکھن'' نے اس بنیاد پر انکار کیا وہ یہ جگہ اس لئے نہیں دے سکتی چونکہ وہ اپنے مولا کا تعزیہ یہاں رکھتی ہیں۔ نواب آصف الدولہ بہادر بہ نفس نفیس ''لاڈو ساکھن'' کے پاس تشریف لے گئے اور وہی گزارش کی، لیکن ''لاڈو ساکھن'' نے وہی بات پھر کہی کہ میں یہاں اپنے مولا کا تعزیہ رکھتی ہوں لہذا یہ جگہ میں نہیں دے سکتی۔ نواب آصف الدولہ نے فرمایا کہ جن مولا کا تعزیہ آپ یہاں رکھتی ہیں انھیں مولا کے ذریعہ اور تعزیہ کے لئے ایک امامباڑے تعمیر کروانا چاہتا ہوں، لہذا میری یہ گزارش ہے کہ آپ مجھے یہ زمین

> شاہی امامباڑوں کی اعلیٰ مثال آصفی امامباڑہ ہے جو تین منزلہ ہے اور اس کی ایک چھت ہے، اس کے آرکیٹکٹ حافظ کفایت اللہ ہیں جو کہ ایک ایرانی نسل کے تھے اس امام باڑے کی دیواریں 15/فٹ چوڑی ہیں جن کے اندر تین تین فٹ کے راستے اور سیڑھیاں ہیں جن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر وقت ہوا اور روشنی کا گزر ہوتا رہتا ہے اور یہ جاڑوں میں گرم اور گرمی میں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ ان کے درمیان سفوکیشن محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی تعمیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یک جوئی ہے جس کو ملی میٹر بائی ملی میٹر ناپا جاسکتا ہے۔ جسمیں کسی طرح کا فرق محسوس نہیں پایا جاسکتا۔

دیدیں، ''لاڈو ساکھن'' نے نواب آصف الدولہ بہادر کی بات مان لی، لیکن اس کے لئے دو شرط رکھی کہ وہ جس تاریخ کو اپنا تعزیہ رکھتی ہیں اور جس جگہ رکھتی ہیں امامباڑہ بننے کے بعد وہ تعزیہ اسی جگہ رکھا جائے۔ نواب صاحب نے یہ شرط منظور کرلی۔ اور ''لاڈو ساکھن'' نے بغیر کسی اجرت کے کے نواب کو وہ زمین ہدیہ کردی۔

1784 میں آصفی امامباڑے کی تعمیر ہوئی اور تب سے ''لاڈو ساکھن'' کا وہ تعزیہ جو بڑھیا کا تعزیہ بھی کہلاتا ہے 28 ذی الحجہ کو آصفی امامباڑے میں گشت کروا کے اسی مقام پر رکھا جاتا ہے جس مقام پر ''لاڈو ساکھن'' رکھتی تھیں۔ اور پہلی محرم کو جب شاہی محرم کو جلوس آصفی امامباڑے سے برآمد ہوتا ہے تو اسی جاہ حشم کے ساتھ شاہی ضریح کے پیچھے ''لاڈو ساکھن'' کا تعزیہ بھی ہوتا ہے۔

اس واقعہ سے نواب آصف الدولہ بہادر کی رحم دلی غربا پروری اور مولا کی کے لئے ہر کس و ناکس کا برابر کا جذبہ احترام شامل ہوتا تھا جو کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں جنھوں نے تاج محل بنوایا اور اس کے بعد اس کے معمار شیرازی جو کہ ایرانی نسل کے تھے ان کا ہاتھ کلائی سے قلم کروادیا گیا کہ کوئی دوسرا تاج محل نہ بن سکے۔ یہ شرف صرف لکھنؤ کو حاصل ہے کہ یہاں کے نوابین نے شاہی مسجدیں، شاہی امامباڑے، روضے اور کربلائیں تعمیر کروائیں۔ جن کی شہرت پوری دنیا میں ہے اور یہ شہر انھیں تعمیرات کی وجہ سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب اپنے پرانے نقوش کے طرز پر لکھنؤ میں آج بھی قائم ہیں، جب کہ دنیا میں مختلف روضے اپنی شکل بدل چکے ہیں، یہ اس نظریے سے تعمیر کئے گئے کہ وہ زائرین جو اپنی عمر، کمزوری معاشی حالات یا کنھیں وجوہات کی بنا پر زیارت کو نہیں جاسکتے ان کے لئے یہ زیارت

گاہیں لکھنؤ میں موجود ہیں۔ یہاں خانہ کعبہ کو چھوڑ کر مسجد النبوی ، مسجد کوفہ، گیارہ اماموں کے روضے بارہوں امام کی سرداب (غار) فاطمین زینبیہ ، شاہ نجف، جنت البقیع، قتل گاہ، جناب عباس کی درگاہ جناب مسلم کا روضہ اور دیگر زیارت گاہیں موجود ہیں، جن میں ماتم اور مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ لکھنو کو ایک شرف اور حاصل ہے کہ جتنے اقسام کی میناریں اور گنبدیں لکھنؤ میں موجود ہیں وہ دنیا کے کسی ایک شہر میں نہیں ملیں گیں۔

شاہی امامباڑوں کی اعلیٰ مثال آصفی امامباڑہ ہے جو تین منزلہ ہے اور اس کی ایک چھت ہے، اس کے آرکیٹکٹ حافظ کفایت اللہ ہیں جو کہ ایک ایرانی نسل کے تھے اس امام باڑے کی دیواریں 15 رفٹ چوڑی ہیں جن کے اندر تین تین فٹ کے راستے اور سیڑھیاں ہیں جن کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر وقت ہوا اور روشنی کا گزر ہوتا رہتا ہے اور یہ جاڑوں میں گرم اور گرمی میں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ ان کے درمیان سفوکیشن محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی تعمیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یک جوئی ہے جس کو ملی میٹر بائی ملی میٹر ناپا جاسکتا ہے۔ جسمیں کسی طرح کا فرق محسوس نہیں پایا جاسکتا۔ اس امامباڑے کی دالان سے گزر کر جہاں منبر رسول رکھا ہے وہ پہلا ہے ہال ہے جو ''چائنیز ہال'' کہلاتا ہے۔ جس کی بنیاد ہشت پہلو ہے، اور چھت کی گنبد گول ہے، اس ہال سے جب آپ سینٹرل ہال میں داخل ہوتے ہیں تو یہ ''پرشین'' ہال کہلاتا ہے جو (ریٹینگلر) ہے اس میں شاہ نشین پر تبرکات جیسے صندل کی ضریح، تابوت، جناب علی اصغر علیہ السلام کا جھولا سونے اور چاندی کے نایاب نقشی پنجے، آری اور زردوزی کے کام کے نایاب پٹکے اور مختلف ضرتیں سجیں ہوئیں ہیں۔ اسی ہال کے بیچ میں نواب آصف الدولہ کی مصنوعی قبر ہے ان کی اصل قبر اس کے نیچے بنی ہوئی ''بھول بھلیا'' کے تہہ خانے میں موجود ہے جو یکی ہے۔

اس امامباڑے میں جو سینٹرل ہال ہے وہ بغیر لوہے اور لکڑی کے استعمال کے بنایا گیا ہے جو دنیا کا سب سے بڑا ہال مانا جاتا ہے جس کی چھت میں آپ کنڈے لگے ہوئے دیکھتے ہیں کبھی اس میں قمقمے ٹنگے ہوتے تھے، جن کی اندر کی (لیر) پارے سے پالشڈ ہوتی تھی ، اسی ہال میں قد آوار آئینے دیواروں کے کنارے کنارے سجے ہوئے ہیں ،اور چھت سے جھاڑ و فانوس، شیشے کے جھابے، شیشے کی ہانڈیاں وغیرہ سجی رہتی تھیں، اور جب ان میں شمع روشن کی جاتی تھی تو اس کا رفلیکشن ان قمقموں پر پڑ کر ان قد آوار آئینوں پر رفلیکٹ ہوتی تھی جس سے پورا ہال بقعہ نور ہو جاتا تھا۔

اس امامباڑے کا تیسرہ ہال ''انڈین ہال'' کہلاتا ہے جس کی چھت خربوزے کی شکل کی ہیں۔ یہ عمارت ''ایرکویشن'' پر ٹکی ہوئی ہیں اور کسی طرح سے اس عمارت سے ہوا نکال لی جائے تو یہ عمارت بیٹھ جائے گی جو کہ ناممکن ہے اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ تیسری منزل کی راستے میں بیچ میں ایک ایسا مقام ہے جہاں سے دوسرے منزل کے ذریعہ اور گراونڈ لویل اور روڈ تک کا چلتا پھرتا انسان صاف نظر آتا ہے جو ''ماسٹر آف انجینیر نگ'' میں ایک چیپٹر ہے اور اس کے میٹریلس میں مختلف اقسام کی دالیں ، سیہ، گڑ، بیل کا رس، سریس ، گوند ، چونے اور سرخی میں ملا کر اس کا مسالہ تیار ہوتا تھا جس لکھوری اینٹ کی چنائی ہوتی تھی، اس امامباڑے میں استعمال ہونے والی لکھوریاں سب سے بڑے سائز 18/6 انچ کی استعمال ہوئی ہیں ۔اس کے بعد دیگر شاہی عمارتوں میں استعمال ہونے والی لکھوریاں چھوٹی ہوتی تھیں۔ اس امامباڑے میں موجود بھول بھولیا قصداً نہیں بنائی گئی تھیں، لیکن اس کی وسیع چھت کا وزن منتشر کرنے کے لئے یہ محرابیں بنائی گیں جس نے بعد میں بھول بھلیا کی شکل دیدی، جیسے کہ اک کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور انسان کو بہت سوچ سمجھ کر بولنا چاہئے، یہ محاورہ ان بھول بھلیاں کے ان گلیریوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ان دیواروں پر اپنا کان رکھے اور سوفٹ دور اسی دیوار پر کوئی شخص بہت مدھم آواز میں بدبدائے تو اس کی پوری آواز دوسری طرف صاف سنائی دیتی ہے۔ یہ ٹیلیفونک سسٹم کی ایک مثال ہے ۔ ان دیواروں پر کوڑیوں سے گھسائی ہوتی تھی اور مسالے میں ان گوڑیوں کا چورا ملایا جاتا تھا جس کی وجہ یہ دیواریں سنگ مرمر کی نظر آتی ہیں۔ جس میں وہ جلا ہوتی تھیں۔ اسی امامباڑے میں ایک شاہی باولی ہے۔ جو سات منزلہ ہے اس کی چار منزلیں پانی کے نیچے اور تین اوپر ہیں۔ شاہی دور میں یہ حسن خانوں کا کام کرتی تھیں، اور اکثر بیگمات دوپہر میں یہاں اپنا وقت گزارتی تھیں ، اسی امامباڑے کی مسجد اور رومی گیٹ کے درمیان ایک مسافر خانہ تھا جس میں مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس طرغ سے یہاں کے دیگر شاہی امامباڑے، روضے اور کربلائیں ہیں مثلاً محمد علی شاہ اودھ کے تیسرے بادشاہ کا تعمیر کردہ چھوٹا امامباڑہ نواب مرزا علی خاں جو نواب آصف الدولہ بہادر کے ماموں تھے۔ ان کا بنویا ہوا کالا امامباڑہ، نواب واجد علی شاہ بہادر کا تعمیر کردہ امامباڑہ سبطین آباد بھی ہے جو حضرت گنج میں واقع ہے جس میں ان کے والد امجد علی شاہ بہادر کی قبر ہے اور اس طرز کا امامباڑہ نواب واجد علی شاہ بہادر نے کلکتہ کے مٹیا برج میں تعمیر کروایا جہاں وہ خود دفن ہیں۔

گولہ گنج ملکہ زمانی کا امامباڑہ جس کی خوبی یہ ہے کہ آپ کہیں تشریف فرما ہوں آپ کو منبر رسولؐ صاف نظر آے گا۔ ملکہ گیتی کا امامباڑہ جو ماڈل ہاوس میں ہے۔ نواب آغا میر کا امامباڑہ جو سٹی اسٹیشن پر ہے لیکن افسوس اس میں بڑا جیلی کالج چل رہا ہے، جس میں ممتاز انٹر کالج ہے وہ گونگے نواب کا امامباڑہ تھا۔ نرہی میں نواب آغا میر کی جو کربلا تھی اس میں اب فری میسن لاج جو کہ کالا جادو گھر بھی ہے کہلاتا ہے، جامع

مسجد سے متصل ملکہ جہاں کا امامباڑہ جو کہ بڑے امامباڑے کے طرز پر بنوانا چاہتی تھیں، جس کے ستون ڈلوا کر امامباڑے کو مکمل کیا گیا۔ ریجیڈینسی کا امامباڑہ جو کہ نصیر الدین بادشاہ کی کرسچن بیوہ جو کہ مسلمان ہوگئیں تھیں انھوں نے تیار کروایا تھا وہاں بھی مومنین علم اٹھاتے ہیں اور مجلس کرتے ہیں۔

غازی الدین حیدر اودھ کے ساتویں نواب اور پہلے بادشاہ کا تعمیر کردہ روضہ شبیہ نجف ہے جس کی گنبد کی ڈانٹ میں آٹھ من سونا لگا ہے، جو شیشہ کے آلات سے مرصع ہے اور شہ نشین پر تبرکات سجے ہیں۔ اس روضے میں ایک ایسا قدآور آئینہ ہے جس کے سامنے ت وہ مریض جو مفلوج ہیں آکر سات بار اپنے قدم آگے پیچھے بڑھاتے ہیں اور اپنی شکل اس آئینہ میں دیکھتے ہیں ان کو شفا ملتی ہے، اسی روضے سے متصل قدم رسول تھا جو 1857 میں انگریزوں نے توپوں سے اڑا دیا تھا۔ اور وہاں پتھر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نقش پا تھے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کی بنوائی ہوئی کربلا جو کہ ہندوستان کی سب سے بڑی کربلا کہلاتی ہے اس کربلا کی آراضی پر شیعہ پی جی کالج اور ڈالی گنج ریلوے اسٹیشن قائم ہے۔ کربلا دیانت الدولہ کے بارے میں ایک بار کا واقعہ ہے کہ نواب واجد علی شاہ بہادر کے ساتھ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ تشریف فرما تھے اور نواب واجد علی شاہ کا ایک بے تکلف خواجہ سرا وہاں موجود تھا جس نے میر صاحب سے اپنے یہاں مجسل پڑھنے کا وعدہ لینا چاہا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ جب تم اپنا امامباڑہ تعمیر کرلوگے تو میں مجلس ضرور پڑھوں گا، اسی وقت نواب واجد علی شاہ بہادر نے اس خواجہ سرا کو دیانت الدولہ کے خطاب سے نوازہ اور ان ے نام سے یہ امامباڑہ منسوب کردیا شاید یہ نوابین کی فکر تھی کہ کوئی بھی شخص جس کا کوئی بھی مسلک یا جینڈر ہو اس سے محروم نہ رہ جائے اس لئے ایسے اقدام کرتے رہتے تھے، اس کربلا کی تعمیر میں ایرانی کاریگروں کی بہترین شیشہ کاری تھی لیکن دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ختم ہوگئیں۔

پار کی کربلا یہاں روضۃ کے تہہ خانے میں بارہوں امام علیہ السلام کا ''غار'' ہے اور گیارہوں امام حسن عسکری علیہ السلام کا روضہ ہے جہاں شب برات کی رات بھر زائرین کا ایک ہجوم رہتا ہے جو مٹی کے کونڈوں میں نذر کا ترحلوہ زائرین کو چکھاتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سے قیصر باغ کی سفید بارہ دری اصل میں نواب واجد علی شاہ کا تعمیر کردہ امامباڑہ تھا جس کا نام ''قصر العزا'' تھا اور شاہی دور میں اس میں مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ 1857 میں انگریزوں نے جب اودھ پر قبضہ کر لیا تو ساری ملکیت انگریزوں کی ہوگئی، انگریزوں نے برٹش انڈین ایسوسیشن ''انجمن ہند تعلقدار اودھ'' قائم کی جس کے صدر مہاراجہ بلرام پور ہوئے اور یہ ملکیت مہاراجہ بلرامپور نے مہاراجہ دگوو جئے سنگھ کو قصر العزا کی آراضی کے سارے مالکانہ حقوق ان کو دیدیا۔ مہاراجہ دگو جئے سنگھ نے بارہ دری کو (انجمن ہند) کے دفتر کو دیدی، جس میں آج عزاداری کے علاوہ، بی آئی اے کا آفس ہے اور دیگر سماجی رسوم کے لئے کرائے پر دیا جاتا ہے۔ ان باتوں کی توثیق مرے پاس واجد علی شاہ کے فرمان کے ساتھ موجود ہیں جسے میں اپنی بات کی تصدیق کے لئے پیش کرسکتا ہوں۔

روضہ کاظمین کی بنیاد گزاری نواب سعادت علی خاں نواب شجاع الدولہ کے صاحبزادے اودھ کے چھٹے نواب کی بنا پر لالہ جگن ناتھ سے ناراض ہوگئے تھے لہذا ان پر عتاب نازل ہوا اور انھیں شہر بدر کردیا، انھوں نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ ایسا کیا کیا جائے کہ نواب مجھ سے خوش ہوجائیں اور مجھے پھر سے بحال کردیں۔ انھوں نے روضہ کاظمین کی تعمیر کی جو بہت ہی خوبصورت روضے کی شبیہ ہے اور اس میں اندر چھتوں پر بہترین خطاطی کی ہوئی ہے، اور اسی روضے کے اطراف میں خاک پاک کی مسجد ہے اس کے سامنے دس محرم کی شاہی ضریح اور 8 ربیع الاول کو چپ تعزیہ دفن کیا جاتا تھا لیکن افسوس کہ جب عزاداری کے شاہی جلوس اور باقی 153 رجسٹرڈ جلوسوں پر پابندی عائد ہوئی اور بیس سل بعد تین فریقین یعنی (گورنمنٹ۔ اہل سنت۔ اور شیعہ) میں جو معاہدہ ہوا اس کے تحت سال میں 10 رجلوسوں کے نکلنے جانے کی اجازت ملی اور 10 رمحرم کی شاہی ضریح کے نکلنے پر پابندی لگ گئی اور تقریبا ستائس سال یہ 10 رمحرم کی شاہی ضریح کا جلوس جو اپنی شان وشوکت کے ساتھ اٹھ کر روضہ کاظمین جاتا تھا اور ضریح دفن کی جاتی تھی وہ اب تک موقوف ہے۔ شاہی ضریح کے جلوس کو احتجاجا بند کردیا گیا تھا کہ شاید پورے ہندوستان ان جلوسوں کے نہ اٹھنے سے خلفشار مچ جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا، یہ ضریح ہماری وراثت اور گنگا جمنی تہذیب 1839 سے جو لکھنوی تہذیب کا نمونہ تھی جس میں ہر مذہب وملت کے لوگ زیارت کے لئے شریک ہوتے تھے اب ہم اس سے محروم ہیں۔

لکھنو کا شاہی جلوس

1837 سے 1842 تک اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ بہادر کا دور رہا جنھوں نے حسینہ آباد کا امامباڑہ المعروف چھوٹا امامباڑہ تعمیر کروایا اور حسینہ آباد مبارک ٹرسٹ قائم کیا 1839 سے شاہی ضریح کے جلوس کی بنیاد پڑی جو کہ پہلی محرم کو اپنی شان وشوکت کے ساتھ آصفی امامباڑے سے اٹھ کر پہلے شہر میں گشت کرتا تھا اور چھوٹے امامباڑے میں میں اختتام ہوتا تھا۔ دس محرم کو شاہی ضریح اس اہتمام کے ساتھ چھوٹے امامباڑے سے اٹھا کر روضہ کاظمین میں دفن کی جاتی تھی، اس جلوس میں اولا حسینہ آباد مبارک کا نشان (بینر) ہوتا ہے اس کے پیچھے روشن چوکیاں ہوتی ہیں جس پر نوبت کے ساز اور نقارہ، چھانچھ، پیپر ہی اور سامنے بگل ہوتا ہے اس روشن چوکی کے پیچھے سبیل ہوتی

ہے۔جس میں دودھ پستے بادام کا شربت زائرین کے لئے ہوتا ہے اس کے بعد ہاتھی ہوتے ہیں جن پر شاہی دور کے ماہی مراتب ،جس میں تاج ،سورج ،سیف ،شیر اور مچھلی چاندی کے عصوں پر نکالے جاتے ہیں۔ایک زمانے میں تقریبا اکیس ہاتھی اور ان کے پیچھے تقریبا پینتیس اونٹوں کی قطار جن پر سیاہ لباس میں لوگ چاندی کے علم لئے ہوئے ہوتے تھے۔اور ان میں پیدل چلنے والوں کے دستے ہوتے ہیں ،اور ان کے ہاتھوں میں سرخ ،سبز ، اور سیاہ جھنڈیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ملیٹری بینڈ، پولیس بینڈ، اور پرائیویٹ بینڈ ماتمی دھنوں بجاتے ہوئے چلتے ہیں ،ان کے پیچھے کشتی میں انگیٹھی ،لوبان دان گلاب پاش ،شمع دان، دونوں جانب مور پنکھیاں لئے ملازمین اور عصا بردار ہوتے تھے، اور ان کے پیچھے سوز خوان اور مرثیہ خوان سوز اور مرثیہ پڑھتے ہوئے چلتے ہیں۔جس میں گریہ وبکا ہوتا تھا،ان کے پیچھے امام حسین علیہ السلام کا دلدل جو اپنے ساتھ سونے اور چاندی کے ساز سے سجا ہوا اور ایک سفید چادر جس پر خون کے دھبے اور تیر پیوست ہوتے تھے دلدل کی پیٹھ پر ایک عمامہ اور اوپر ایک چھتری سے آراستہ ہوتا تھا۔وہ دس محرم 61ھ کے بعد عصر امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس ضریح اور دلدل کی زیارت کے لئے ہر مذہب وملت کے لوگ جلوس کے وقت سے کافی پہلے آکر اپنے اپنے مقام پر بے صبری سے انتظار کرتے ہیں کہ زیارت ہوجائے ،دلدل کو دودھ اور جلیبی اور ملیدہ مختلف مذہب وملت کے لوگ کھلاتے ہیں اور اس کی جوٹھن اپنے گھر لیجاتے ہیں اور ثواباس کو چکھتے ہیں۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ ہندو عورتیں اپنے بچے کو طویل عمر اور صحت کے لئے امام حسین کی شبیہہ دلدل کے نیچے سے اپنے بچوں گزارتی ہیں۔لکھنو کی یہی وہ عزاداری کا کلچر اور تہذیب وثقافت ہے جو ہمارے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی زندہ علامت ہے۔حسینہ آباد مبارک ٹرسٹ کے بینر جو جلوس کے آگے ہوتا ہے۔شیر اونیوں میں ملبوس حسینہ آباد ٹرسٹ کے متوالیان سوگوارانہ انداز میں سر برہنہ چلتے ہیں اور صوبے گورنر ہمیشہ ضریح کی زیارت کو آیا کرتے تھے، اور ان کے افسران اور وہ خود جب شبیہہ ان کے سامنے سے گزرتی ہے تو وہ احترام جھک جاتے ہیں۔ضریح اس دور میں تقریبا تین بجے سہ پہر برآمد ہوتی تھی اور بجلی کاٹ دی جاتی تھی اور جلوس کے آگے آگے ملازمین لمبے لمبے لگے جس میں دو شاخے لگے ہوتے تھے وہ بجلی

> 1837 سے 1842 تک اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ بہادر کا دور رہا جنھوں نے حسینہ آباد کا امامباڑہ المعروف چھوٹا امامباڑہ تعمیر کروایا اور حسینہ آباد مبارک ٹرسٹ قائم کیا 1839 سے شاہی ضریح کے جلوس کی بنیاد پڑی جو کہ پہلی محرم کو اپنی شان و شوکت کے ساتھ آصفی امامباڑے سے اٹھ کر پہلے شہر میں گشت کرتا تھا اور چھوٹے امامباڑے میں میں اختتام ہوتا تھا۔دس محرم کو شاہی ضریح اس اہتمام کے ساتھ چھوٹے امامباڑے سے اٹھا کر روضہ کاظمین میں دفن کی جاتی تھی ، اس جلوس میں اولا حسینہ آباد مبارک کا نشان (بینر) ہوتا ہے اس کے پیچھے روشن چوکیاں ہوتی ہیں۔

کے تاروں کے اونچا کرنے کے لئے چلتے تھے تا کہ ضریح کو آگے لیجانے میں کوئی قباحت نہ ہو، ہاتھی اور اونٹوں کے ساتھ جمعدار چھاڑو اور پنجے لے کر چلتے ہیں صفائی کے لئے۔اور اس شاہی جلوس کے راستوں میں ایڈمنسٹریشن کی طرف سے سبیل وغیرہ کا بھی اہتمام کی جاتا ہے۔انجمنوں کے علاوہ۔

مہندی کا شاہی جلوس

کہا جاتا ہے کہ اودھ کے تاجدار محمد علی شاہ بہادر نے جب پہلی محرم کے جلوس کا شاہانہ طور سے آغاز کیا تو ان کے خواب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم تشریف لائے اور انھوں نے بشارت دی کی تم نے میرے شہزادے قاسم کے لئے کچھ نہیں سوچا ، بادشاہ نے اسی بشارت کے تحت حکم دیا کی مہندی کے جلوس کا اہتمام کیا جائے اور جناب قاسم کی مہندی کا جلوس ساتھ محرم کو آصفی امامباڑے سے اپنی شان وشوکت کے ساتھ اٹھایا جانے لگا۔جس کا اختتام امامباڑہ محمد علی شاہ (چھوٹا امامباڑہ) کے ہوا۔اس جلوس می پہلی محرم کے جلوس کی طرح اہتمام ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ اس میں ضریح اور ''لاڈو ساکھن:: کا تعزیہ نہ ہوکر جناب قاسم کی مہندی کی رسومات کے مطابق مہندی بنائی جاتی ہے کہاروں کے سر پر خوان ہوتے ہیں اس میں پھل میوے شمع روشن ہوتی ہیں۔اور اس جلوس کی زیارت کے لئے بھی ہر مذہب وملت کے لوگ تشریف لاتے ہیں۔ایک دور تھا جب کہ محرم میں ہونے والی لکھنؤ کی عزاداری میں شرکت کرنے کے لئے ایران واعراق اور دیگر ممالک کے لوگ بھی تشریف لاتے تھے۔

اس مہندی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جناب قاسم سے متعلق ایک نوحہ پڑھا جاتا ہے جس کا مطلع کچھ یوں ہے۔

ہائے رو ، رو کے فروئی پکاری
آج مہندی ہے قاسم تمہاری

اس نوحے کو جلوس میں دو نوحہ خوان تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں اور اسی نوحے کو بینڈ والے اپنی دھن میں بھی پڑھتے ہیں ،اس دردانگیز نوحے کی کیفیت لوگوں کے دلوں پر اس طرح سے طاری ہوتی ہے کہ لوگوں کی آنکھیں آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔

دس محرم کو لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف جس کا نام ریحانہ تھا اس کی ڈیوڑھی جو بزازے میں واقع تھی اس کے وہاں سے ایک علم برآمد ہوتا تھا۔جس کی زیارت کرنے کے لئے کافی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے ے تقسیم ہندو پاک کے بعد ریحانہ نے ہندوستان سے

ترک وطن کی اور جا کر پاکستان میں مقیم ہوگئی۔

شجاع الدولہ کے فیض آباد سے آصف الدولہ کے لکھنؤ تک

مغل بادشاہ اکبر اعظم نے اپنے نورتنوں میں سے ایک راجہ ''ٹوڈرمل'' جو کہ ضلع سیتا پور کے قصبے لہر پور کے رہنے والے تھے انھیں یہ کام سونپا گیا کہ ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا جائے جس کا ایک وسیع اور زرخیز صوبہ اودھ تھا جس کے سرحد نیپال سے، کانپور کی طرف گنگا دوسرے کنارے تک تھی اودھ کا رقبہ بہت وسیع تھا جس کے پہلے صوبے دار شیخ عبدالرحیم شیخ زادے تھے جس مقبرہ ''ندامحل'' تھا جس کو اب نادان محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔لکھنؤ میں لال پتھر کی واحد عمارت ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ شیخ زادے اتنے طاقتور ہوگئے کہ انھوں نے اودھ کا خراج مغلیہ خزانے کو بھیجنا موقوف کر دیا یہ دور 1722ء محمد شاہ رنگیلے مغل بادشاہ کا تھا جنھوں نے نواب سعادت علی خاں برہان الملک کو اودھ کا صوبے دار بنا کر بھیجا جو مغلیہ فوج کے ساتھ ایودھیا کے نزدیک فیض آباد تشریف لائے جس کو پہلے ''بنگلہ'' کہتے تھے۔

ایسی خاموشی کے ساتھ انھوں نے لکھنؤ کا حصار کیا کہ شیخ زادوں کو خبر تک نہ ہوئی یہ سید تھے، ساتویں امام کی اولاد میں سے تھے ان کا وطن ایران کا مشہور شہر نیشاں پور تھا۔ جو انتہائی بہادر فاضل و قابل اور اچھے منتظم تھے۔ جب یہ دریائے گومتی سے ایک کشتی پر تشریف لا رہے تھے، اتفاقاً ایک مچھلی پانی سے اچھل کر ان کی آغوش میں آ گری، جسے انھوں نے اچھا شگون تصور کیا۔اسی لئے انھوں نے اپنے ''کورٹس آف وارٹس'' میں دو مچھلیوں کا جوڑا ''ان سگنیہ'' کے طور پر استعمال کیا جس کو یوپی گورنمنٹ نے ''راجہ رام چندر جی کے تیر و کمان'' کے ساتھ دو مچھلیوں کا جوڑا اپنی مہر میں محفوظ کر لیا۔ یہ مچھلی کا جوڑا امامباڑوں روضوں مساجد، مندروں، محلسر اؤں، حویلیوں اور خانقاہوں کے صدر دروازے پر آج بھی نظر آتے ہیں۔

نواب سعادت خاں برہان الملک نے اس دور کے شیخ زادوں کو دعوت دی اور فرمایا کہ میں بادشاہ کے حکم سے آپ سے یہ حکومت لینے آیا ہوں بہتر ہوگا کہ خوش اسلوبی سے اسے سونپ دیں اور اگر ایسا نہ کیا تو جنگ کر کے آپ سے چھین لیں گے۔ بہت ہی آسانی کے ساتھ اودھ کی صوبے داری کو نواب سعادت خاں کو منتقل ہوگئی، اور ان شیخ زادوں کو لکھنؤ سے دس میل دور عالم نگر کی طرف بجنور میں ایک جاگیر عطا کی اور سات دن کی مہلت دی کہ جو کچھ اپنا قیمتی سامان ہے لے جائیں اور بجنور میں آباد ہو جائیں۔اور ایسا ہی ہوا۔

1722 سے نوابین اودھ اور شاہان اودھ کا دور شروع ہوا جو کہ 1856 کو نواب واجد علی شاہ اودھ کے آخری تاجدار پر ختم ہوا۔شیخ زادوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ جس کو ''مچھی باون'' کہتے تھے جو بگڑ کا آج ''مچھی بھون'' ہوگیا۔جس کو 1857 میں انگریزوں نے ڈائنا مائٹ سے اسے اڑا دیا، اور ریجیڈینسی میں اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ نواب سعادت خاں برہان الملک کا انتقال 1739 میں ہوا اور اپنی وصیت کے مطابق ان کو سونپی ہوئی میت کو کربلا معلیٰ میں دفن کیا گیا۔ ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا تو انھوں نے اپنی بیٹی کو ایران سے فیض آباد بلوایا اور اپنی بیٹی کا عقد اپنے بھانجے سے کیا جو اودھ کے دوسرے نواب، نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کہلائے جن کا مقبرہ دہلی میں ہے اور انھیں کے نام سے صفدر جنگ ہاسپٹل اور صفدر جنگ ایر پورٹ اور صفدر جنگ انکلیو موجود ہے۔ ان کے صاحبزادے نواب جلال الدین حیدر شجاع الدولہ بہادر کہلائے جو کہ بہت ہی شجاع اور نفیس مزاج کے انسان تھے، انھوں نے فیض آباد کی داغ بیل ڈالی اور فیض آباد کو اپنا دار الخلافہ بنایا اور انھیں کے دور مس فیض آباد میں محل عمارتیں مساجد، جواہر علی خاں کا امامباڑہ اور باغات کی تعمیر ہوئی۔ انھیں پیراکی کا بہت شوق تھا اور آپ نے اپنا محل سریوندی کے کنارے پر بنوایا تھا جہاں سے وہ روز صبح دریا میں پیراکی کا شغل فرماتے تھے۔ایک دن آپ دریا میں نہا رہے تھے کہ مگر مچھ نے ان کے داہنے پر کو اپنے جبڑوں سے چبا لیا اور انھوں نے اپنی کمر میں لگی ہوئی کرولی سے مگر مچھ کو ہلاک کر دیا، پھر جا کر ان کی جان بچی، لیکن ان کے داہنے پیر گھٹنے سے خراب ہوگئے لہذا گھٹنے سے نیچے لکڑی کے پیر لگائے گئے جس کا نمونہ حسینہ آباد کی پکچر گیلری میں موجود ہے جس کو دیکھنے سے نمایاں ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے داہنے پر کی ٹوہ کو جس زوائے سے بھی دیکھے تو اس کی ٹوہ اس کی نگاہوں کی طرف ہی ہر سمت سے گھومتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔1775 میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر اودھ کے چوتھے نواب ہوئے اور انھوں نے اپنا دار السلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا جو نواب واجد علی شاہ تک دار السلطنت رہا۔نواب آصف الدولہ بہادر نے آصفی امامباڑہ، موسی باغ، کوٹھی بیبا باغ، اور متعدد عمارتیں بنوائیں جن میں ان کی رہائش گاہ دولت خانہ، یا دولت خانہ آصفی، جس کو انگریزوں نے آصفی کوٹھی بھی کہا اس کا نام انھوں نے ''شیش محل'' رکھا تھا، جو کہ ایک نبی خدا حضرت شیعث علیہ السلام کے نام منسوب تھا، چونکہ یہ شیشوں کے آلات سے انتہائی مزین تھا کہ جسے لوگ اسے شیش محل کہنے لگے۔

دولت خانے میں ایک سنگ مرمر کی ایک خوبصورت مسجد ہے جو کہ پتھر والی مسجد کہلاتی ہے جو آج بھی آباد ہے اور ایک شاہی تالاب بھی بنوایا جس کے ڈائمنشن 250/260 فٹ ہے جس کی گہرائی 60 فٹ ہے۔مشرقی طرف قد آور دیوار تھی اور دو پھاٹک بھی تھے، مشرق کی سمت میں جو دیوار ہے اس میں برابر سے طاق بنے ہوئے تھے جس میں گہی کے چراغ روشن ہوتے تھے، اور بیچ میں ایک خوبصورت ''سہ دری'' تھی جہاں نواب آصف الدولہ بہادر سہ پہر

چار بجے مچھلی کا شکار کرتے تھے، اور خدائے سخن میر تقی میر شعر و شاعری کرتے تھے، اسی تالاب میں رنگین مچھلیاں تھیں جن کی ناک میں سونے کی نتھنیاں جن پر زمرد اور یاقوت کی مڑیاں پڑی ہوتی تھیں، جو دیکھنے میں بڑی خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ نواب آصف الدولہ بہادر مچھلیوں کے شکار میں پوری طرح منہمک تھے، مچھلی چارہ کھا رہی تھی، چال ہونے ہی والی تھی اور کسی بھی وقت ہاتھ مارا جا سکتا تھا اسی دوران میر تقی میر نے فرمایا کہ غزل کا پہلا مطلع ملاحظہ فرمایں نواب نے ہاں، ہوں میں داد دی میر صاحب نے کہا غزل کا دوسرا مصرعہ ملاحظہ کریں، جس سے نواب کا ذہن منتشر ہو رہا تھا اور نواب نے فرمایا کہ کلام اچھا ہو تو داد دل سے نکلتی ہے جو میر صاحب کو ناگوار گزرا پھر بھی انھوں نے فرمایا کہ غزل کا تیسرا شعر ملاحظہ کریں جس پر نواب نے جواب دیا کہ میں تو ایسا کلام بیت الخلا میں بیٹھ کر کہتا ہوں، جس سے میر صاحب چراغ پا ہو گئے اور فرمایا کہ اس میں سے بو بھی ویسے ہی آتی ہوگی۔ دوسرے روز سہ پہر کو چار بجے میر صاحب تشریف نہیں لائے نواب کو فکر ہوئی تو انھوں نے اپنے ملازم بھیج کر میر صاحب کی خیریت دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ میر صاحب کو اتنا صدمہ پہونچا کہ وہ بستر مرگ پر آ گئے ہیں۔ اب نواب صاحب بالنفس نفیس ان کی مزاج پرسی کو تشریف لے گئے اور ان کی داہنی انگلی میں ایک عقیق کی انگھوٹی تھی جس پر شفا کی لئے دعا کندہ تھی نواب صاحب نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر استاد کی انگلی میں پہناتے ہوئے فرمایا کہ اس کے پہننے سے انشا اللہ شفا ہوگی، میر صاحب نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

دیوانہ پن ہمارا آخر کو رنگ لایا
جو دیکھنے کو آیا ہاتھوں میں سنگ لایا

میر صاحب نے ناراض ہو کر شیش محل چھوڑ دیا اور تحسین علی خاں کی مسجد میں رہنے لگے 1797 میں نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد چار مہینے کے لئے ان کے صاحبزادے اودھ کے پانچویں نواب ہوئے، جن کو ایک انگریز کے قتل کے جرم میں قید کر لیا گیا اور نواب سعادت علی خاں جو نواب آصف الدولہ کے مختلف البطن بھائی تھے وہ اودھ کے ساتویں نواب ہوئے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ نواب کی شاہی سواری چوک کے بازار سے گزر رہی تھی اور اس زمانے کا یہ دستور تھا جو شخص جس جگہ ہوتا تھا وہیں دست بستہ سر جھکا کر تعظیم میں کھڑا ہو جاتا نواب کی نظر ایک بزرگ پر پڑی جو اکڑو بیٹھے ہوئے ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہا تھا، اور ان میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو نواب نے دریافت کیا کہ یہ شخص کون ہے معلوم ہوا کہ یہ استاد شاعر میر تقی میر ہیں۔ شاہی سواری روکی گئی، نواب اترے اور ان کے نزدیک آ کر فرمایا کہ بھائی صاحب کے زمانے میں جو کچھ ہوا اسے درگزر فرمائیں اور محل تشریف لے آئیں۔ میر صاحب کا جواب تھا کہ سڑک پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنا شرفا کا شیوا نہیں ہے، پھر نواب صاحب نے باضابطہ اہلکار کے ذریعہ تیرہ پارچے کے خلعت کے ساتھ دعوت نامہ بھیجا جس پر میر صاحب نے اسی اہلکار کا قلم لے کر یہ تحریر فرمایا کہ میں فقیر ضرور ہوں لیکن اتنا رزیل نہیں کہ ایک اہلکار کے ہاتھوں دعوت نامہ قبول کروں یہ اس دور کے بزرگ کی وضعداری تھی کہ نہ آنا تھا نہ آئے۔

حسینہ آباد مبارک ٹرسٹ

محمد علی شاہ بہادر کا حسینہ آباد مبارک اودھ کے تیسرے بادشاہ غازی الدین حیدر کے بھائی محمد علی شاہ بہادر 63/سال کی عمر 1837 سے 1842 تک اودھ کے تیسرے بادشاہ ہوئے، آپ نے چھوٹے امامباڑے کی تعمیر کی حسینہ آباد کی لال بارہ دری، حسینہ آباد کا تالاب، سست کھنڈا، رئیس منزل، شریف منزل، لنگر خانہ بنوایا۔ انگریزوں کو (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو آپ نے چھتیس لاکھ کا لون دیا اور ایک معاہدہ کیا اور اپنی وصیت کے مطابق 1839 میں حسینہ آباد مبارک قائم کیا۔ جس کے تحت ہماری عبادت گاہیں درج ہیں۔ محرم کے شاہی جلوس رمضان المبارک کی سحری و افطاری کے انتظام اور مجالس کے تبرک، غریب و غربا کو امداد کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جانے کے لئے غربا کی امداد اور جاڑوں میں غریبوں کو کنبل وغیرہ کی تقسیم کی جاتی ہے۔

اس ٹرسٹ میں رفیق الدولہ بہادر کے خاندان سے دو ٹرسٹیز شاہی خاندان سے دو ٹرسٹیز ہوا کرتے تھے جس کمیٹی کے چیرمین لکھنؤ ڈویژن کے کمشنر ہوا کرتے تھے، لیکن اب جب کہ کوئی کمیٹی نہیں۔ لیکن اب لکھنؤ ڈسٹرک مجسٹریٹ حسینہ آباد ٹرسٹ کے چیرمین اور انھیں کے اے ڈی ایم سٹی کو حسینہ آباد ٹرسٹ کو سکریٹری کا عہدہ سونپ دیا گیا ہے۔ جو کہ شیعہ مسلک کے عقائد اور رسم و راوج سے کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً حسینہ آباد ٹرسٹ کے اپنے مسائل کے سلسلے میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پہلے شیعہ فرقے کا کوئی رٹائرڈ آفیسر حسینہ آباد ٹرسٹ کا سکریٹری ہوا کرتا تھا۔ جو کہ بادشاہ کی وصیت اور اودھ کے رسم و رواج کے مطابق کام کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ اور اے ڈی ایم سٹی وہ کام خود انجام دیتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کے تحت آنے والی حسینہ آباد مبارک ٹرسٹ کی تعمیرات کی مرمت کرائی جاتی ہے۔ جن میں اکثر ذاتی انا کی وجہ سے منتظمین حسینہ آباد ٹرسٹ اور آثار قدیمہ کے درمیان وہ خوشگوار ماحول نہیں رہ پاتا جس کی بنا پر عمارتوں کو نقصان پہونچتا ہے۔ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹرسٹ حسینہ آباد میں ضم کر دئے گئے اور اب حسینہ آباد (انڈومینٹ اینڈ الائیڈ ٹرسٹس) کہلاتا ہے جن کے چیرمین لکھنؤ ڈسٹک مجسٹریٹ ہیں اور سکریٹری اے ڈی ایم سٹی ویسٹ ہیں۔

❑❑❑

سلام
رثائی ادب کی ایک اہم صنف

ڈاکٹر عابد حسین حیدری
پرنسپل ایم جی ایم (پی جی) کالج سنبھل
موبائل: 9411097150

اردو کا منظوم رثائی ادب جن اصناف پر محیط ہے ان کو مرثیہ، سلام، ماتم، نوحہ اور روایت کہتے ہیں۔ ان رثائی اصناف میں سلام پر سب سے پہلے تنقیدی نظر سید امداد امام اثرؔ نے 'کاشف الحقائق' میں ڈالی اور اس کی ادبی اہمیت کی طرف اہلِ نظر کی توجہ دلائی۔ اردو سلاموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے رثائی شعراء کے یہاں ان اصناف میں تفریق کا شعور تھا۔ امداد امام اثرؔ نے یہ بات درست لکھی ہے کہ عروضی ترکیب کی رو سے غزل، سہرا اور سلام شے واحد ہیں مگر ان کے مضامین اور تقاضے ایک دوسرے سے علیحدہ انداز رکھتے ہیں۔

علی جواد زیدی نے امداد امام اثرؔ کے درج بالا الفاظ کی تصدیق کرتے ہوئے 'سلام کا ارتقائی سفر' (مشمولہ دو ماہی العلم ممبئی (مرثیہ و سلام نمبر) جون ۱۹۹۳ء) میں لکھا ہے کہ 'عروضی ترکیب یوں اہمیت نہیں رکھتی کہ بعض سلام مثلث، مربع اور مخمس کی شکلوں میں بھی لکھے گئے ہیں۔ پھر جس عروضی ترکیب میں رثاء، تبریک (سہرا) اور نسیب جیسی مختلف کیفیاتِ ذہنی نظم ہوں اسے صنف کا سنگِ بنیاد قرار دینا مناسب بھی نہ ہوگا۔ علی جواد زیدی کی اس رائے کی تطبیق تمقام حسین جعفری کے درج ذیل الفاظ سے ہوتی ہے:

'عروضی ہیئت کے پیشِ نظر دکن میں جو سلام لکھے گئے ان کو مرثیہ کہا جاتا تھا۔ دکنی ادب کی تاریخوں کی ورق گردانی سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں فرماں رواؤں کی سرپرستی میں سلام نما مرثیہ کو عروج حاصل ہوا'

(صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقاء: تمقام حسین جعفری: ص ۱۵)

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ رثائی ادب میں ایک مستقل صنف کے طور پر سلام کب وجود میں آیا۔

مرحوم دلشاد حسین زید پوری نے اپنے ایک مضمون 'مرزا دبیر کے مطبوعہ سلام' مشمولہ مرثیہ و سلام نمبر دو ماہی العلم ممبئی میں لکھا ہے کہ 'جہاں تک میرا حقیر مطالعہ ہے اس کا ٹھیک سراغ نہیں ملتا کہ سلام کہنے کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور وہ پہلا ہندوستانی شاعر کون ہے جسے سلام گوئی کا موجد کہا جا سکے؟' ان کا خیال ہے کہ 'مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کے طرزِ خوانندگی کا جز جس طرح مرثیہ کے ساتھ رباعی کو قرار دیا اسی طرح مرثیہ کے ساتھ سلام کی تصنیف مرثیہ نگاروں کو پسند آئی ہو اور اس طرح سلام کو عام رواج مرثیہ نگاروں کے سبب حاصل ہوا ہو یا پھر یوں عرض کروں کہ سلام کہنے کی ابتدا ہندوستان میں مرثیہ نگاروں نے بھی پہلے کی ہو۔

لیکن رفعت رضوانہ کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلا صنف سلام کا صاحب دیوان شاعر شمالی ہند کا پناہ علی بیگ افسردہ ہے۔ جس نے سلاموں کے دو دیوان باب السلام اور دار السلام کے نام سے مرتب کئے تھے۔ (دیوان سلام سراج: رفعت رضوانہ: مشمولہ دو ماہی العلم ممبئی (مرثیہ و سلام نمبر) جون ۱۹۹۳ء: ص ۱۹۱)

پناہ علی بیگ افسردہ کے علاوہ رفعت رضوانہ نے حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری کے مخطوطات میں 'دیوان سلام سراج' کا سراغ بھی لگایا ہے۔ جس پر تفصیلی مضمون دو ماہی العلم ممبئی کے مرثیہ و سلام نمبر میں شائع ہوا ہے۔

مرحوم دلشاد حسین زید پوری نے اپنے ایک مضمون 'مرزا دبیر کے مطبوعہ سلام' مشمولہ مرثیہ و سلام نمبر دو ماہی العلم ممبئی میں لکھا ہے کہ 'جہاں تک میرا حقیر مطالعہ ہے اس کا ٹھیک سراغ نہیں ملتا کہ سلام کہنے کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور وہ پہلا ہندوستانی شاعر کون ہے جسے سلام گوئی کا موجد کہا جا سکے؟' ان کا خیال ہے کہ 'مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کے طرزِ خوانندگی کا جز جس طرح مرثیہ کے ساتھ رباعی کو قرار دیا اسی طرح مرثیہ کے ساتھ سلام کی تصنیف مرثیہ نگاروں کو پسند آئی ہو اور اس طرح سلام کو عام رواج مرثیہ نگاروں کے سبب حاصل ہوا ہو یا پھر یوں عرض کروں کہ سلام کہنے کی ابتدا ہندوستان میں مرثیہ نگاروں نے بھی پہلے کی ہو اور اسے فروغ انیس و دبیر نے دیا ہو۔'

علی عباس حسینی نے 'اردو مرثیہ میں سلام اور نوحہ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'سلام اور نوحے میں غزل کی طرح مطلع، حسن مطلع اور مقطع ہوتا ہے اور بحر و قافیہ و ردیف کا التزام بھی۔ سلام مرثیوں کی طرح تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں اور نوحہ اور ماتم بڑے لحن سے گریہ آور دھنوں میں تال، سر کا لحاظ کر کے۔ ان کو پڑھتے وقت سینہ زنی بھی کی جاتی ہے۔' علی

جواد زیدی نے 'دہلی مرثیہ گو' میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ 'مرثیہ کا اطلاق ہر رثائی نظم پر ہوتا ہے۔ شروع میں سلام، نوحہ کے اشعار بھی اسی ضمن میں آتے تھے۔ اور عمومی اعتبار سے سب کو مرثیہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ابتدائی مرثیوں کی عروضی ہیئت بھی ایک نہیں تھی۔ منفردہ، مسدس، مربع، مثلث، مخمس، مستزاد اور ترجیع بند سبھی اقسام و اشکال کے مرثیے پائے جاتے ہیں۔ بعد میں مختلف طرز ہائے خوانندگی کا ارتقا ہوا تو نوحہ اور سلام کے اقسام سامنے آئے بلکہ سلام کی بھی دو قسمیں ہوگئیں۔ ایک سوز کے لئے اور ایک تحت اللفظ پڑھنے کے لئے۔'

علی جواد زیدی نے 'سلام کا ارتقائی سفر' میں لکھا ہے کہ 'سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے جو صرف اردو میں پھلی پھولی۔' یہی وجہ ہے کہ فارسی شاعری کے مقابل اردو میں سلام گوئی کی روایت کافی مستحکم ہے۔' امداد امام اثر کا قول ہے 'سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہئے۔ سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آتا ہے۔' علی جواد زیدی نے امداد امام اثر کی اس تعریف سلام پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اثر کے یہاں سلاموں کے تاریخی ارتقا کے مجموعی تصور کی کمی ہے۔ سلاموں کی تاریخ پر نظر کیجئے تو ان کے بیانات ہر دور پر صادق نہ آسکیں گے۔ صنف سلام کا ارتقا تدریجی ہوا ہے۔' علی جواد زیدی نے سلام گوئی کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے 'انیس کے سلام' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ 'شروع کے سلاموں میں بس ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی ہے اور زبان و بیان تک کی حیثیت ثانوی ہے۔ ممدوح کے لئے عقیدت اور والہانہ محبت کا اظہار ہی اصل محرک ہے۔ دھیرے دھیرے اس میں ادبی عناصر کی آمیزش ہوئی ہے۔ معاملات ذہنیہ اور واردات قلبیہ کا ادبی اظہار اور بعد کی ترقی ہے۔'

شہدائے کربلا اور ائمہ اہلِ بیت کے حوالے سے جو سلام کہے گئے ہیں ان کی ہیئت اور تکنیک کوئی مخصوص نہیں ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر ضمیر، فصیح، دلگیر اور خلیق نے جو سلاموں کی ہیئت کا استعمال کیا، وہ اس قدر مقبول و محبوب ہوا کہ ان کے عہد سے لے کر موجودہ عہد تک جتنے بھی سلام کہے جا رہے ہیں ان میں انہی کی تقلید و تاسی کی گئی ہے۔ کچھ شعرا نے ردیف و قوافی کی پابندی کی لیکن بعض شعرا نے قوافی کی پابندی نہیں کی۔ جیسے دکن کے مشہور شاعر مرزا ابو القاسم بیجا پوری نے درجہ ذیل سلام میں قوافی کی پابندی نہیں کی:

ہادیٔ رہبر حسین شاہ سلام علیک
فاضل محشر حسین شاہ سلام علیک

مرزا ابو القاسم بیجا پوری کے درج بالا سلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ان شعرا کو رثائی اصناف کی ادبی پرکھ کا گہرا شعور تھا اور انہوں نے ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے اس کا تجربہ کیا۔ اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے 'دبستانِ دبیر' میں لکھا ہے کہ 'ہیئت اور مواد کے اعتبار سے اردو مرثیہ خالص ہندوستانی ذہن و فکر کی ایجاد ہے۔ عربی، فارسی مراثی کی شکل میں اردو میں سلام، نوحے یا ماتم کہے گئے ہیں۔' موصوف نے مرثیہ کے علاوہ اردو کی رثائی اصناف کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ سلام

اگر یہ نظم غزل کے انداز پر ہو، ایک ہی ردیف و قافیہ میں کہی گئی ہو تو اسے سلام کہتے ہیں۔ سلام میں جہاں غم آفریں اشعار ہوتے ہیں وہیں مدحیہ اشعار بھی ہوتے ہیں۔ اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین بھی سلام میں نظم کئے جاتے ہیں۔ غرض سلام ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کی ہیئت تو غزل کی ہوتی ہے لیکن مواد کے اعتبار سے اس میں مدح، مرثیہ، بین، فلسفہ اور اخلاقیات سبھی شامل ہوتے ہیں۔

۲۔ ماتم

دوسری صنف نظم وہ ہے جسے ماتم کہتے ہیں۔ یہ صنفِ سخن ہیئت کے اعتبار سے سلام سے مماثل ہوتی ہے لیکن اس میں صرف غم انگیز اشعار ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ایسے اوزان اختیار کئے جاتے ہیں جن پر آسانی سے سینہ زنی ہو سکے۔

۳۔ نوحہ

تیسری صنفِ سخن نوحہ کہلاتی ہے جس میں شاعر آلِ رسول کی زبان سے امام یا ان کے کسی عزیز کی موت پر ماتم کرتا ہے۔ یہ صنف ماتم سے اس اعتبار سے مختلف ہوتی ہے کہ ماتم میں شاعر اپنے ذاتی تاثرات نظم کرتا ہے اور نوحہ میں خود آلِ رسول کے مختلف افراد کے جذبات نظم کئے جاتے ہیں۔

۴۔ واقعہ

چوتھی صنف واقعہ کہلاتی ہے۔ یہ وہ نظم ہوتی ہے جو مثنوی کی شکل میں کہی جاتی ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ اردو میں سلاموں کے دیوان کی روایت موجود ہے اور اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر مرزا پناہ علی بیگ افسردہ ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شمالی ہند کے ان شعرا سے قبل دکن میں مرثیہ کے ساتھ ساتھ سلام کی بھی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور میں اکثر شعرا نے سلام کہے ہیں:

دل بند مصطفی کا تابوت لے چلے ہیں
فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
(ہاشمی بیجا پوری)

نظامی قیامت کا کچھ ڈر نہ کر
حسین شاہ شاہاں سلام علیک
(نظامی برہان پوری)

جنوبی ہند کے رثائی ادب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں سلام نما مرثیے لکھے گئے۔ اس دوران زبان نے بھی تدریجی مراحل طے کئے اور ہندی/دکنی کو ریختہ کہا جانے لگا۔ عروضی ہیئت میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ موضوع میں بھی تنوع پیدا ہوا، واقعہ نگاری، رخصت اور شہادت کا اضافہ ہوا۔ مرثیہ/سلام کا مقصد رونا رلانا تھا۔ اس کے پیشِ نظر سادگی، خلوص اور تاثیر دکنی عہد کے لکھنے والوں کی مشترک قدریں ہیں۔ ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کی تباہی کے بعد جنوبی ہند انقلاب زمانہ کا شکار ہو گیا۔ کچھ شعرا کا کلام خلفشار کی نذر ہو گیا لیکن بعض شعرا کا کلام بیاضوں میں محفوظ رہ گیا۔ اس لئے مرثیہ/سلام کی روایات باقی رہ گئیں اور فضا سازگار ہوتے ہی شمالی ہند کے شعرا نے ان روایات کو آگے بڑھایا۔

شمالی ہند میں جو شکل ابتدائی مرثیوں کی صورت میں غزل کی ہیئت میں ظاہر ہوئی تھی اس نے سلام کی شکل اختیار کر لی اور اس کا ارتقا مرثیہ کی ایک ضمنی صنف کی حیثیت سے ہوا۔ ابتدائی مرثیہ کی ہیئت نے آہستہ آہستہ مسدس کی شکل اختیار کر لی اس کے باوجود سلام لکھے جاتے رہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مجلس میں مرثیہ پڑھنے کے لئے ایک خاص فضا کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔

سلام سوز خوانی میں 'دھن' سے پڑھے جاتے تھے لیکن پیش خوانی میں بغیر ترنم کے۔ سوداؔ، میرؔ، ضاحکؔ اور اس کے بعد مصحفیؔ، جرأتؔ اور میر حسنؔ نے صنفِ سلام کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ ان شعرا نے اپنے نظم کردہ سلاموں میں براہِ راست امام حسینؑ کو مخاطب کیا:

حسین تجھ کو یہ عرش بریں کرے ہے سلام
وہاں سے آن کے روح الامیں کرے ہے سلام
(سوداؔ)

اے نبی کے باطناً رتبہ کے والی السلام
ظاہر ان سے بھی ہو تم اک نوع عالی السلام
(میر تقی میرؔ)

کربلا کے قتیل تم پہ سلام
راہِ حق کی دلیل تم پہ سلام
(میر غلام حسین ضاحکؔ)

کہ وہ دو جہاں کا امام ہے کرم اس کا خلق پہ عام ہے
یہ حسنؔ اسی کا غلام ہے وہ نواز دے گا غلام کو
(میر حسنؔ)

مصحفیؔ اور جرأتؔ کے معاصرین میں خلیقؔ، ضمیرؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ بھی صنفِ سلام کی ترقی میں کوشاں رہے۔ میر خلیقؔ نے سلاموں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ان کا آخری سلام بہت مشہور ہوا۔ جس کا مقطع درج ذیل ہے:

گزری بہار عمر خلیقؔ اب کہیں گے سب
باغ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

خلیقؔ کے سلاموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنفِ سلام میں نصیحت، عبرت اور موعظت کے مضامین کا نہایت خوش اسلوبی سے اضافہ کیا گیا۔ اور بین میں مکالماتی لہجے کو بھی اختیار کیا گیا۔ مرثیہ کے ان عناصر اربعہ کی کاوشوں سے سلام کے موضوعات میں بھی اضافے ہوتے رہے اور اسالیب بیان بھی وضع کئے گئے۔ ضمیرؔ نے سلام میں واقعہ نگاری کا اضافہ کیا اور ان کے سلاموں میں زبان کی شیرینی، سلاست و روانی، شگفتگی و رعنائی کے ساتھ ساتھ جدت و ندرت بھی ہے۔ ساتھ ہی فصیحؔ کے سلاموں میں جہاں تعلّی کا اظہار ہے وہیں دلگیرؔ کے یہاں بین کا عنصر زیادہ نمایاں ہے:

وہ کس طرح سے دکھاویں گے منھ پیمبر کو
جنھوں نے بلوے میں زینب کو بے نقاب کیا
(میر ضمیرؔ)

الٰہی کرتا ہوں شکر نعمت بڑا یہ احساں ہے رب اکبر
ہ میرا مسکن ہے کوہِ مروہ نصیب ہر دم ہے آبِ زمزم
(مرزا فصیحؔ)

لے کے تابوت سکینہ کو کہا عابد نے
میت اٹھتی ہے یوں ہی بے سر و سامانوں کی
(دلگیرؔ)

مرثیہ کے عناصر اربعہ کے سلاموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سلاموں میں زبان دانی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی جائزہ بھی ہے اور اندوہ ناک واقعات پر تبصرہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں انیسؔ و دبیرؔ جیسے شاعروں نے بھی انہی خطوط پر سلام کہے اور صنفِ سلام کو معراج پر پہنچا دیا۔ تمقام حسین جعفری نے ان اساتذہ کے سلاموں کے مطالعے کے بعد سلام گو شعرا کے لئے درج ذیل خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری قرار دیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱۔ **ایجاز و اختصار:** سلام میں غزل کی طرح اختصار ہونا چاہئے۔ اسی لئے واقعات کربلا کے پس منظر میں سلام لکھنے والے کے خیالات بھی ایجاز کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔

۲۔ **ایمائیت:** غزل کی طرح سلام کے اشعار میں بھی ایمائیت کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ **اسلوبِ بیان:** اسلوبِ بیان میں شگفتگی ہونی چاہئے۔ تاکہ اربابِ ذوق کے لئے سلام کے اشعار میں قصیدے کا لطف پیدا ہو سکے۔

۴۔ **زبان:** سلام میں زبان سلیس اور عام فہم ہونی چاہئے۔ یاد رہے کہ سلاست کے زمرے میں روانی اور برجستگی دونوں شامل ہیں۔

۵۔ **صنائع بدائع:** تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کے برمحل استعمال سے سلام کے اشعار میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۶۔ **رثائیت:** سلام کے اشعار میں واقعات کربلا کا بیان اس طرح کیا جائے کہ اثر انگیزی میں کمی واقع نہ ہونے پائے۔

۷۔ **تعدادِ اشعار:** جہاں تک سلام کے اشعار کی تعداد کا تعلق ہے اس میں کم سے کم نو شعر ضرور

ہوں۔ پچاس سے زائد اشعار بھی اساتذہ نے سلام میں نظم کئے ہیں۔

تمقام حسین جعفری نے اپنی تالیف 'صنفِ سلام اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا' میں سلام اور نوحہ کے بنیادی فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ (۱) سلام سوز خوانی میں درد آگیں لہجے میں پڑھے جاتے ہیں اور نوحے بعد اختتام مجلس یا جلوس تعزیہ و تابوت میں پڑھے جاتے ہیں۔ (۲) سلام پیش خوانی میں تحت اللفظ کے انداز میں پڑھے جاتے ہیں۔ منبر کے تقدس کے پیشِ نظر ترنم سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ (۳) سلام سوز خوانی اور تحت اللفظ دونوں میں پڑھے جاتے ہیں لیکن دونوں کی ادائیگی میں فرق ہے۔ سلام کا لہجہ سنجیدہ مدھم اور نرم ہونا چاہئے۔

علی جواد زیدی نے 'انیسؔ کے سلام' کے مقدمے میں انیسؔ کے سلام پر تفصیلی بحث کی ہے لیکن ان کے ہم عصر دبیرؔ کے سلام پر آج تک خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا جبکہ دبیرؔ کے سلاموں کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دبیرؔ کو اپنی سلام گوئی پر ناز تھا:

یہ سلام شہ ابرار کہا خوب دبیرؔ
دیکھ انعام میں مولیٰ تجھے کیا دیتے ہیں

انیسؔ و دبیرؔ کے سلام دو طرح کے ملتے ہیں۔ ایک کی ابتدا لفظ سلام اور سلامی، مجرئی اور مجرائی کے ساتھ اور دوسرے غزل کی طرح۔ دبیرؔ کے یہاں مدحیہ اشعار خال خال ہیں، بینیہ اشعار زیادہ ہیں۔ میر انیسؔ اور ان کے بھائیوں انسؔ اور مونسؔ کے یہاں مدحیہ اشعار نسبتاً زیادہ ہیں۔ انیسؔ نے اپنے سلاموں میں تشبیہات و استعارات سے کام لیا ہے اور بعض ایسی لفظوں کو بھی جگہ دے دی جو ہمارے روزمرہ سے بلند ہیں:

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

انیسؔ کے سلاموں کی جدت نے دبیرؔ کو اساتذہ کے رنگ میں نیا آہنگ اور اسلوب پیدا کرنے پر مجبور کیا اور اس آہنگ میں نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ بینیہ عنصر نے دبیرؔ کو کامیابی سے ہمکنار کیا:

حشر میں جوہری اشک عزادار ملے
ایک اک اشک کے بدلے درشہوار ملے
متفق حبّ علی پر ہوں جو سب اہلِ جہاں
ایک بھی پھر نہ قیامت میں گنہ گار ملے
دی دعا ماں نے یہ عباس کو ہنگامِ سفر
جا تجھے مرتبۂ جعفر طیار ملے
اب تلک تربت صغریٰ سے یہ آتی ہے صدا
ایسے بچھڑے کہ نہ پھر سید ابرار ملے

انیسؔ و دبیرؔ کے عہد میں اردو شاعری کا سب سے اہم نام غالبؔ کا ہے۔ جس نے اپنی غزلوں سے اردو شاعری کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ عطا کیا۔ انہوں نے بھی اپنے سلاموں میں بھی جدت طرازی کے ساتھ علم الکلام کے فلسفیانہ مضامین پیش کر کے سلام گوئی میں بھی ایک منفرد مقام حاصل کر لیا:

سلام اسے کہ اگر پادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ نہ سلطاں یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامس آلِ عبا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علی سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانئے گر ہم برا کہیں اس کو
علی کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین
کرے جو ان سے برائی بھلا کہیں اس کو
نبی کا ہونہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو
بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

غالبؔ کے ساتھ ہی انیسؔ کے برادرِ خرد مونسؔ کے سلام جہاں سلاست اور ندرت کا آئینہ ہیں وہیں خانوادۂ انیسؔ کی برتری کے شاہد بھی:

مہر تاباں سے فزوں ہوتا منور آئینہ
نعل دلدل سے بناتا گر سکندر آئینہ
خود نمائی ننگ ہے روشن دلوں کے واسطے
کس طرح ظاہر کرے باطن کے جوہر آئینہ
کھنچ گئی ہے دل پہ مونس ماہ زہرا کی شبیہ
کس نے دیکھا ہے اس آئینے سے بہتر آئینہ

انیسؔ و دبیرؔ اور غالبؔ کی روش پر اردو سلام گوئی کا یہ کارواں دن بہ دن ترقی کرتا گیا اور ترقی پسندی کے دور میں جوش، آل رضا، نسیم اور جمیل مظہری کے علاوہ نجم آفندی، سردار جعفری، علی جواد زیدی اور شمیم کرہانی وغیرہ نے سلام گوئی پر بھرپور توجہ دی اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری، اصلاح اور سیاسی جبر کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے تصور کو پیش کیا۔

ساٹھ کی دہائی میں بانی تنظیم المکاتب مولانا غلام عسکری نے کہا تھا کہ 'عزاداری کے فانوس میں دین داری کی شمع روشن کرو۔' اس تحریک کے پیشِ نظر علامہ ذیشان حیدر جوادی اور مولانا کرار حسین واعظ نے شعرا کو اس طرف متوجہ کیا کہ عزاداری رسم نہیں عبادت ہے۔ اس مہم میں قاسم شبیر نصیر آبادی، شفق بھاگلپوری، دبیر سیتا پوری، شفق شادانی، پیام اعظمی اور خود علامہ ذیشان حیدر جوادی نے اپنے اشعار سے حسینی پیغام کو عام کیا:

وہ اک سماج جسے کربلا نے ڈھالا ہے
اسی سماج کو دینی سماج کہتے ہیں
(کلیم الہٰ آبادی)

□□□

اردو غزل میں سانحۂ کربلا کا علامتی اظہار

ڈاکٹر ظفر النقی

موبائل: 7905478241

اردو کے کلاسیکی ادب میں سانحۂ کربلا کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے اور فضلی کی دہ مجلس جس میں امام حسینؑ اور اولاد حسینؑ کے مصائب وآلام بیان کئے گئے ہیں، کی پہلی نثری تصنیف کا شرف حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دکنی عہد کی غزلوں اور مثنویوں میں بھی کربلا کی تلمیحات ملتی ہیں۔ گویا اردو زبان کی ابتدا ہی سے اس پر سانحۂ کربلا کی پرچھائیں نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن گوپی چند نارنگ نے اردو زبان کی ابتدا سے قبل ہندوستان کی دوسری زبان پر بھی سانحۂ کربلا کے اثرات کو محسوسات کیا ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ:

''سرائیکی، سندھی، پنجابی، اودھی، دکنی اور بہت سی روایتوں میں ایسا ذخیرہ ملتا ہے، جس میں خون کے آنسوؤں کی آمیزش ہے۔ اردو میں صنف مرثیہ کے باقاعدہ وجود میں آنے سے پہلے دہے، نوحے وغیرہ پڑھے جاتے تھے۔''

گوپی چند نارنگ کے اس اقتباس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی لوک روایتوں میں سانحۂ کربلا کے اثرات موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا سے قبل ہندوستانی سماج پر سانحۂ کربلا کا اثر مرتب ہو چکا تھا، جس کے باعث ہندوستان کی مختلف زبانوں کی لوک روایتوں میں اس کے اثرات نفوذ کر گئے کیونکہ بقول گوپی چند نارنگ:

''اسلام کی تاریخ میں بالخصوص اور انسانیت کی تاریخ میں بالعموم کوئی قربانی اتنی عظیم، اتنی ارفع اور اتنی مکمل نہیں ہے جتنی حسینؑ ابن علیؑ کی شہادت ہے۔ حسینؑ کے گلے پر جس وقت چھری پھیری گئی اور کربلا کی سرزمین ان کے خون سے لہولہان ہوئی تو درحقیقت خون ریت پر نہیں گرا بلکہ سنت رسولؐ اور دین ابراہیمی کی بنیادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سینچ گیا۔ وقت کے ساتھ

سانحۂ کربلا سے متعلق تلمیحات کا محدود استعمال کلاسیکی غزل میں مل جاتا ہے، جن کی مثالیں ممتاز حسین جون پوری نے اپنی تصنیف ''خون شہیداں'' میں فراہم کردی ہیں اور گوپی چند نارنگ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں یقیناً ڈھونڈا جاسکتا ہے اور اس کی تلاش سعیٔ لاحاصل نہ ہوگی۔'' نیز گوپی چند نارنگ نے میر تقی میر کے شعروں کو بہ طور مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بہ ظاہر یہ عشقیہ اشعار ہیں لیکن کیا ان اشعار کی امیجری پر تاریخ کی پرچھائیں پڑتی ہوئی نظر نہیں آتی ہیں۔''

ساتھ یہ خون ایک ایسے نور میں تبدیل ہو گیا جسے نہ کوئی تلوار کاٹ سکتی ہے نہ نیزہ چھید سکتا ہے اور نہ زمانہ مٹا سکتا ہے۔''

سانحۂ کربلا سے متعلق تلمیحات کا محدود استعمال کلاسیکی غزل میں مل جاتا ہے، جن کی مثالیں ممتاز حسین جون پوری نے اپنی تصنیف ''خون شہیداں'' میں فراہم کردی ہیں اور گوپی چند نارنگ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کا استعاراتی اظہار غزل کی کلاسیکی روایت میں یقیناً ڈھونڈا جاسکتا ہے اور اس کی تلاش سعیٔ لاحاصل نہ ہوگی۔'' نیز گوپی چند نارنگ نے میر تقی میر کے شعروں کو بہ طور مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بہ ظاہر یہ عشقیہ اشعار ہیں لیکن کیا ان اشعار کی امیجری پر تاریخ کی پرچھائیں پڑتی ہوئی نظر نہیں آتی ہیں۔'' لیکن گوپی چند نارنگ نے میر تقی میر کے علاوہ کسی بھی کلاسیکی شعراء کے یہاں سے مزید مثالیں فراہم نہیں کی ہیں۔ شاید ان کا مطمح نظر نئی شاعری میں علامات کربلا کی جستجو تھی، ورنہ وہ ان شعروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے جن پر کربلا کے عظیم سانحے کی چھوٹ صاف دکھائی پڑتی ہے۔

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی سودا

مصحفی کرب و بلا کا سفر آسان نہیں
سینکڑوں بصرہ و بغداد میں مرجاتے ہیں مصحفی

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے مومن

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے
غالب

ان مثالوں کے باوجود سانحۂ کربلا سے متعلقات کا استعمال کلاسیکی غزل میں محدود اور روایتی معنی سے آگے نہیں بڑھ سکا تاہم استعاراتی طور پر ان تلمیحات کا استعمال بالعموم ان موقعوں پر کیا گیا ہے، جہاں حق و باطل کی آویزش ہوتی ہے یا جبر و استبداد کے تسلط کے خلاف بغاوت کے جذبات ابل پڑتے ہیں چنانچہ انگریزوں کے ظالمانہ اقتدار اور حریت پسندوں پر ان کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے خلاف جب اردو شاعروں نے آواز بلند کی تو سانحۂ کربلا کے استعارے ان کے محسوسات اور واردات کے ترجمان بن گئے۔

گوپی چند نارنگ نے اس عہد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ اقبال، محمد علی جوہر اور جوش اور دو شاعری میں اس رجحان کے بنیاد گزار ہیں۔ گوپی چند نارنگ اقبال کے ''رموز بے خودی'' کے شعروں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی واقعۂ کربلا اور شہادت امام حسین کی نئی معنویت کی طرف سب سے پہلے بھرپور نظر گئی اور اس کا مکمل تخلیقی اظہار اقبال کے فارسی کلام میں زیادہ ہوا ہے لیکن اردو کلام میں بھی اور اس کے تعلیقات کو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اقبال کے شعروں میں تلمیحات کربلا اور اس کے متعلقات علامتی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان شعروں کے ذریعہ اپنے عہد کے مسائل اور موضوعات کی ترجمانی کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے علی میاں ندوی کی کتاب ''نقوش اقبال'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''نعت شہ کونین ؐ کی طرح شہادت سید الشہداء اور سانحۂ کربلا کو اقبال نے نئی جہت، وسعت اور رفعت دی ہے اور وہ بھی اردو شاعری میں ایک اہم اور گراں قدر اضافہ ہے۔ مرثیہ خوانی اور مرثیہ نگاری کو جو اہمیت ہمارے ادب اور زندگی میں ہے اس کو اقبال نے ایک نئے تصور اور تجربہ سے آشنا کیا اور ربط دیا۔ اس طور پر اردو شاعری اور ادب میں مقام شبیری کی ایک نئی معنویت دعوت یا سمبل (علامت) ظہور میں آئی اور مقبول ہوئی اور وہ تصور جو نسبتاً محدود تھا لامحدود ہو گیا۔''

اقبال ہی کے زیر اثر محمد علی جوہر اور جوش کے یہاں کربلا اور اس کے متعلقات کے استعمال کا رجحان آیا۔ اور انہوں نے سانحۂ کربلا کے تلمیحات میں تحریک آزادی میں روح پھونکنے اور کاروان تحریک آزادی کے راہ روؤں کے عزم و حوصلے کو بلند کرنے کیلئے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ہم جب ان کی شاعری کا اس جہت سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی شاعری کے منظر نامے پر ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں، جن میں کربلا اور اس کے متعلقات کو بیان کیا گیا ہے لیکن یہاں ان شعروں کو پیش کر کے تجزیہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ کربلا اور اس کے متعلقات کا استعمال اقبال کے بعد آزادی کے حصول کے لیے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کرنے لگا تھا۔ تاہم گوپی چند نارنگ کا یہ مشاہدہ قابل غور ہے کہ:

''ترقی پسندوں کے انقلابی مفاہیم کے لیے یہ حوالہ (سانحۂ کربلا) جس قدر موثر تھا، اتنے بڑے پیمانے پر ترقی پسند شاعری میں نہیں ملتا۔'' مگر ترقی پسندوں میں آزادی کے بعد فیض کی غزلوں اور نظموں میں ایسے پیکروں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس کا سلسلہ اس تاریخی روایت سے جا ملتا ہے۔ جدیدیت کے تناظر میں سانحۂ کربلا کی تلمیحات نئی معنویت کی حامل ہو گئی ہیں۔ عصر حاضر میں مجموعی انسانی صورت حال، جو میکانیت کے فروغ میں صنعتی شہروں میں آبادی کے پھیلاؤ، سیاسی جبر و تلاش میں بڑے پیمانے پر انتقال آبادی، سامراجی ریشہ دوانیاں، عالمی جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے، قدروں کے زوال اور انسانی رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے سے عبارت ہے اور اجنبیت، تنہائی، خوف کے احساسات جو ساری زندگی میں سرایت کر گئے ہیں، ان کے اظہار کے لیے یہ تلمیحات اور استعارے جدید شاعری میں متنوع انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔ فلسفہ وجودیت کے مستند وجود کی مثال جو سید الشہداءؑ کی ذات میں دکھائی دیتی ہے، جس کی وجہ سے کربلا کے استعارے اور علامیے نئے شاعروں کے لیے زیادہ پرکشش بن گئے۔ نئے شاعروں نے سانحۂ کربلا سے متعلق تعلیقات کو بڑی فن کاری اور چابکدستی کے ساتھ برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تاثیر کی زبردست قوت موجود ہے۔

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا جو تو چاہے
سلگتے جاتے ہیں چپ چاپ بہتے جاتے ہیں
مثال چہرہ پیغمبراں گلاب کے پھول
مجید امجد

ساحل تمام گرد ندامت سے اٹ گیا
دریا سے کوئی آ کے جو پیاسا پلٹ گیا
شکیب جلالی

بجھا ہے رنگ دل اور خواب ہستی کربلا ہے
کہ جیتے میں نہ مرتے ہیں یہ کیسی کربلا ہے
سروں تک آ گیا آب فرات خوف دیکھو
جو پیاسوں کو ڈبو دے گی یہ ایسی کربلا ہے
ظفر اقبال

زوال عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کھلا نہیں کوئی در باب التجا کے سوا
منیر نیازی

پا بہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون
کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درخیمہ پہ اب تک صورت تصویر کون
مری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون
پروین شاکر

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں میں بیٹھے ہیں
گزرے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے
شہریار

پانی تو اب ملے گا نہیں ریگ زار میں
موقع ہے خوب دیکھ لو دامن نچوڑ کے
دل ہے پیاسا حسین کی مانند
یہ بدن کربلا کا میداں ہے
محمد علوی

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھی سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلا
مدت ہوئی سینے سے نکالے ہوئے نیزے
نوک اب بھی کلیجے میں کھٹکتی ہے سناں کی
فرات جیت کے بھی تشنہ لب رہی غیرت
ہزار تیر ستم ظلم کی کمیں سے چلے
وحید اختر

حسین پھر ہیں رواں کربلا کی سمت حسنؔ
خوشا کہ اب کے نہیں کم حسینی لشکر بھی
حسن نعیم

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اک دیا بجھا تو سینکڑوں دیئے جلا گیا
احمد فراز

وہ دریا پہ مجھ کو بلاتا رہا
مگر میں صف تشنگاں میں رہا
پھر مرا سر ہو قلم پھر ہو ترے ہاتھ میں تیغ
معرکہ پھر سر میداں وہی برپا ہو جائے
ہے زوال شام اک آئینہ رو منظر میں ہے
آسماں روشن ہے سارا اور لہو منظر میں ہے
انیس اشفاق

ان شعروں میں سانحۂ کربلا اور اس کے متعلقات علامتی نوعیت کے حامل ہو گئے ہیں اور ان علامتوں کے ذریعے معاصر عہد کی صورتحال کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی لئے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی حیثیت مذہبی روایت کی نہیں رہ گئی ہے بلکہ یہ ایک ادبی روایت بن گئی ہے۔ مثلاً وحید اختر کا درج ذیل شعر موجودہ عہد کی صورتحال کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور ناموافق حالات میں حق کی آواز بلند کرنے کا عزم و ہمت بھی دیتا ہے۔

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھی سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلے

وحید اختر کا یہ شعر اپنی پہلی ہی قرأت میں چونکاتا ہے اور ''نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلے'' یہ مصرعہ ہمارے دلوں کو روشن کرتا ہے اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے کہ جس یزید کے دست ظلم و استبداد نے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے سروں کو کاٹا تھا اور ان کی آواز حق کو مٹانا چاہتا تھا لیکن امام حسینؑ اور ان کے جاں نثاروں کی شہادت کے بعد حق پرستوں اور سچ گویوں کا ایک لشکر نکل آیا۔ یعنی اس وقوع کے اندر یہ معنی موجود ہیں کہ حق کی آواز کو تھوڑی دیر کے لیے ظلم و استبداد اور قوت وطاقت کے ذریعے دبایا تو جا سکتا ہے لیکن حالات کے ٹھیک ہوتے ہی حق پرستوں اور سچ گویوں کی ایک پوری فوج حق کی سربلندی کے لیے تیار ہو جاتی ہے، جس کو کسی صورت دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ اب شکیب جلالی کا شعر دیکھئے:

ساحل تمام اشک ندامت سے اٹ گیا
دریا سے کوئی شخص جو پیاسا پلٹ گیا

اس شعر میں سانحۂ کربلا کے اس وقوعے کی طرف اشارہ ہے، جہاں علمدار لشکر حسینی فرات پر قبضہ کرنے کے باوجود پیاسے پلٹ آئے اور یوں جناب عباسؑ نے وفاداری اور خودداری کا ثبوت دیا کہ امام حسینؑ اور ان کے بچوں کے پیاسے ہوتے ہوئے بھی پانی کیسے پی لیا جائے۔ اب اس وقوعے سے شکیب جلالی نے کس طرح نئے مفاہیم پیدا کئے ہیں کہ ساحل کا اشک ندامت سے اٹ جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دریا میں پانی نہیں ہے۔ ایک پیاسا جب ساحل سے پیاسا جاتا ہے تو ساحل پھوٹ کر رونے لگتا ہے کہ پیاسا اپنی پیاس نہیں بجھا سکا۔ ساحل کو اس قدر افسوس اور ندامت ہے کہ اس کے آنسوؤں سے پورا دریا لبریز ہو گیا۔ آنسو بھی پانی ہی ہے لیکن شاعر نے کس قدر طنزیہ انداز سے کام لے کر دریا کی خشکی کو ظاہر کیا ہے کہ ہر شخص اپنی پیاس بجھا چکا مگر ایک شخص ہے جو پیاسا پلٹ گیا، جس کا ساحل کو بے حد ملال اور افسوس ہے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ پیاسا پلٹ جانے والا شخص بجھا سکتا تھا لیکن پیاسا پلٹ کر اس نے ثابت کر دیا کہ مجھ میں اتنی خودداری ہے کہ میں دریا کو پیاس کے عالم میں بھی ٹھکرا کر لوٹ سکتا ہوں۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ واقعہ کربلا کی اشاریت کو اقبال کے بعد جس شاعر نے اردو شاعری میں مستقل مزاجی اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ افتخار عارف ہے، اور یہی عنصر افتخار عارف کی شاعری کی مؤثر اور منفرد قوت ہے، جو ان کے معاصرین میں اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ واقعہ کربلا کے حوالے سے آج کی زندگی، سیاسی جبر و تشدد، معاشی نابرابری اور مشیتی عہد کی موجودہ صورتحال کو سمجھنے کی یہی کوشش افتخار عارف کی شاعری کا اہم حوالہ ہے، جس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے، بہ قول گوپی چند نارنگ:

''واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اوروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار

عارف کے یہاں یہ بات ان کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ لمحۂ موجود کی پے چیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورتحال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسے مرکزی کردار کا تصور ابھرتا ہے، جو مسلسل ہجرت میں ہے۔ عذابوں میں گھرا ہوا ہے، دربدر خاک بسر مارا مارا پھر رہا ہے اور کوئی دار الاماں اور جائے پناہ نہیں۔ ان کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے جو پیکر ابھرتے ہیں مثلاً پیاس، دشت، گھرانا، گھمسان کا رن، بستی، بیاباں، قافلۂ بے سروساماں، یہ سب ثقافتی روایت کے تاریخی نشانات بھی ہیں اور آج کے عذابوں میں گھری ہوئی زندگی کے کوائف وظواہر بھی۔ ان کا شعری وجدان کچھ اس نوع کا ہے کہ ان کے اشعار صدیوں کے درد کا منظر نامہ بن جاتے ہیں اور ان میں وہ لطف وتاثیر بھی پیدا ہوجاتی ہے، جسے خداداد بھی کہا گیا ہے۔''

یہاں افتخار عارف کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، جس میں علامات کربلا کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے، جس میں اس تاریخی وقوعے نے موجودہ عہد کی صورتحال کو واضح کردیا ہے، مثلاً:

کھلا جو روزن زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

.....

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھ
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
جسکی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانا ہے

.....

دمشق مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغان قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

.....

زرۂ صبر سے پیکان ستم کھینچتے ہیں
ایک منظر ہے کہ ہم دم ہمہ دم کھینچتے ہیں
حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیئے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیر دو دم کھینچتے ہیں

افتخار عارف کے ان شعروں میں روزن زنداں، زنجیر، دعا، نوک سناں، پیاس، دشت، گھرانہ، مشکیزہ، تیر، رن پڑنا، دریا، ڈھالیں، دمشق مصلحت، کوفۂ نفاق، قافلۂ بے نوا، زرۂ صبر، پیکان ستم، سجدہ اور شمشیر وغیرہ کی حیثیت محض الفاظ کی نہیں ہے اور نہ یہ صرف کربلا کے وقوعے کو بیان کرتے ہیں بلکہ ان سے معنی کی کئی جہتیں اور حقیقتیں آشکارہ ہوتی ہیں۔ مثلاً افتخار عارف کا یہی شعر دیکھئے کہ کس طرح موجودہ عہد کی صورتحال کے خلاف ایک مکمل احتجاج کی صورت اختیار کرلیتا ہے:

خلق نے ایک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اس شعر میں افتخار عارف نے خلق، منظر، نوک سناں اور سر کی لفظیات کے ذریعے ساحۂ کربلا کے اس وقوعے کو بیان کیا ہے، جب امام حسینؑ عالی مقام کی شہادت کے بعد ان کے سر کو نوک نیزہ پہ بلند کیا گیا تھا اور کوفہ وشام کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ لیکن افتخار عارف کا مقصد سانحۂ کربلا کے اس وقوعے کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس وقوعے کے تناظر میں اپنے عہد کی صورتحال کی سفاکی کو آشکارہ کرنا ہے۔ اب یہاں ''سر'' مظلومیت، سربلندی، حق گوئی، جرأت، بلند ہمتی، انسانی اقدار اور انسانیت کے علمبردار کی علامت ہے، اور ''نوک سناں''، ظلم واستبداد، جوروستم، استحصالی قوتوں، استعماری طاقتوں اور یزید وقت کی علامت ہے۔ جوروستم، ظلم و جبر، استحصالی قوتوں، استکباری طاقتوں، حق تلفی اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا انسان کا اولین فریضہ ہے، جس کی آج کے انسان کو بہت ضرورت ہے۔ اس لئے افتخار عارف پھر نوک سناں پر کوئی سر بلند ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ استحصالی طاقتوں اور تخریبی کا خاتمہ ہوسکے اور انسانی اقدار بحال ہوسکیں۔

پتھر پر سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

اس شعر میں ''پتھر پر سر رکھ کے سونا'' صبر و شکبائی اور ضبط وتحمل کی علامت ہے اور ''ہاتھوں میں پتھر''، ظلم واستبداد کے خلاف دست احتجاج بلند کرنے کی علامت ہے۔ افتخار عارف موجودہ صورتحال سے گھٹن محسوس کرتے ہیں کہ بستی کے افراد پر ایسی بے حسی طاری ہے کہ وہ ظلم واستبداد کو برداشت کررہے ہیں لیکن اپنے اسی وصف یعنی قوت صبر کو تلوار میں تبدیل نہیں کررہے ہیں۔ اس شعری ردیف ''نہیں دیکھا بہت دنوں سے'' سے ذہن سانحہ کربلا کے اس وقوعے کی طرف جاتا ہے، جہاں گلوئے صبر سے شمشیر ظلم کو کمند کردیا گیا تھا، بس افتخار عارف بھی اسی منظر کو موجودہ عہد کی صورتحال کے خلاف بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ افتخار عارف کے لیے سانحۂ کربلا ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیتا ہے اور اپنے عہد اور اپنے سماج کے اندر پل رہی تخریبی طاقتوں کے خاتمے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

افتخار عارف کے بعد عرفان صدیقی نے کربلا کی علامتوں کو مستقل مزاجی، سنجیدگی اور مکمل تخلیقی قوت کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری

کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف علامات کربلا کو استعمال کیا بلکہ اس میں افتخار عارف کی طرح عصری معنویتوں کی جستجو کی اور اپنے عہد کے مسائل وموضوعات کے بیان میں ان سے نئے نئے معنیاتی جہات بھی پیدا کئے۔

انہوں نے کربلا کے وقوعوں کے توسط سے ایک نیا لفظیاتی نظام ترتیب دیا، جو ان کے معاصر شاعروں میں ایک الگ شناخت کا سبب بنی۔ فرس، ہوار، مقتل، قائل، نوک سناں، نوک نیزہ، صف سردادگاں، سروں کے پھول، خیمہ، سردشت بلا، تیغ، تلوار، خنجر، سجدہ، ستم، برہنہ سر، خون، لہو، ردا، طشت، دولت سر، تیروکماں، صت، لشکر، دست بریدہ، بازو، مشکیزہ، ہوائے ناقہ نا مہرباں، خیمۂ صبرورضا، بازوئے بریدہ، جیت، معرکہ صبروجور، پانی، آب، پیاس، شمع خیمہ، زنجیر، قید، قیدخانہ، اسیری ان الفاظ و تراکیب کے ذریعے عرفان صدیقی کربلا کے وقوعوں کے تناظر میں اپنے عہد کے مسائل وموضوعات اور اپنے عہد کی سفاکیوں کی ترجمانی کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کا ڈکشن بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ان میں اکہرے مفہوم کے بجائے کثرت معانی کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ اب یہاں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تم جو کچھ ہو وہی تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا ہے

.....

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا
ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

.....

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخل دعا نکل آئے

.....

دولت سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزے پہ سجاتا ہے مجھے

خدا کرے صف سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

.....

شمع خیمہ کوئی زنجیر نہیں ہم سفر و
جس کو جانا ہے چلا جائے اجازت کیسی

پہلے شعر میں نیزے اور سر کی علامتوں کے ذریعے سانحۂ کربلا کے اس وقوعے کو بیان کیا گیا ہے، جب شہادت امام حسین کے بعد ان کے سر کو نیزے پر بلند کیا گیا تھا مگر وہی نیزہ جو باطل قوتوں اور تخریبی طاقتوں اور جبر و تشدد کی علامت تھا، مظلومیت، حق پرستی، حق گوئی، سربلندی، سرافرازی اور انسانی اقدار کا تحفظ کا ذریعہ بن گیا۔ یہی سبب ہے کہ ملوکیت اور شہنشاہیت کے زرخیز مورخ چاہ کر بھی حقیقتوں کو مسخ نہ کر سکے۔ یعنی دیکھا جائے تو جس نیزے کو حقیقتوں کو چھپانے کے لیے استعمال کیا گیا، وہی نیزہ حقیقتوں کو روشن اور آشکارا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

دوسرے شعر میں مٹی، مظلومیت، صبر وضبط اور بے گناہی اور تلوار، ظالمانہ قوتوں اور جابرانہ طاقتوں کی علامت ہے۔ یہ شعر بھی سانحۂ کربلا کا پس منظر لئے ہوئے ہے کہ باضمیر اور حساس انسان کبھی بھی ظالم و جابر کے ہاتھوں اپنی عزت نفس اور توقر گردی نہیں رکھ سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امام حسینؑ نے بیعت کو ٹھکرانے کے بعد سر دینا گمراہ کرلیا، لیکن کیا ہوا۔ امام حسینؑ کے سر دینے کے باوجود قلب باطل میں ان کا معنوی وجود کھٹکتا رہا اور اپنی موجودگی کا اندراج کراتا رہا۔ کیونکہ شہادت حسینؑ کے بعد بھی لہو احتجاج بن کر باطل کی قوتوں اور جاہ وجلال پر خاک ڈال گیا۔ یعنی ظالم کے جبر وتشدد کے بعد مظلوم انسان کے دل میں رعب، دبدبہ اور عزت نفس اور توقیر کا جذبہ باقی ہے تو باطل گویا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔

تیسرے شعر میں دست بریدہ کی فصل بونے کے نتیجے میں نخل دعا کا نکلنا ایک طرف دست بریدہ اور نخل دعا کے رشتے کو نمایاں کرتا ہے تو دوسری طرف پہلا مصرعہ ظلم کے نتیجے کو ظاہر کرتا ہے جبکہ دوسرا مصرعہ نالہ وفریاد کے ردعمل کو۔ اہم بات یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں نہ ظلم کا ذکر واضح کیا گیا اور نہ دوسرے مصرعے میں ردعمل یا فریاد کی کوئی وضاحت کی گئی ہے۔ یعنی استعماری قوتیں اور استحصالی طاقتیں چاہ کر بھی پرچم حق کو سرنگوں نہیں کرسکتیں اس لئے پرچم حق کے نگوں کے لیے ایک ہاتھ کاٹا گیا تو اس کو بلند کرنے کے لیے سینکڑوں ہاتھ پیدا ہوجائیں گے۔

عرفان صدیقی کے اس قبیل کے شعروں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے سانحۂ کربلا کے وقوعات سے ماخوذ علامات ولفظیات کو محض اکہرے مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ان علامتوں کے ذریعے اپنے عہد کے مسائل وموضوعات کی ترجمانی کی ہے اور اپنے عہد کی معنویتوں سے متعلق کردیا ہے۔

سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ نئی غزل میں اہمیت تو دی جارہی تھی تاہم مابعد جدید غزل میں ایک اہم رویے کی صورت اختیار کرگیا ہے کیونکہ مابعد جدید غزل میں اس موضوع کا اظہار بطور علامت ہوا ہے۔ مابعد جدید غزل گو شعراء میں عرفان صدیقی اور افتخار عارف نے خصوصیت کے ساتھ تلمیحات کربلا کو بطور استعارہ مسلسل اور مستقل مزاجی سے استعمال کیا ہے۔ (جیسا کہ اوپر کی گئی گفتگو سے واضح ہے) واقعہ کربلا جابر حکومت کے خلاف ایک طرح کا احتجاج کرتی ہے اس لئے کربلا اور اس کی تعلیقات کے استعمال سے مابعد جدید شعری اظہار میں احتجاج کی کیفیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ احتجاج انسانی صورتحال کے خلاف بھی ہے اور سیاسی جبر و استبداد کے خلاف بھی، اور اس استحصال کے خلاف بھی، جس کی زد پر بالخصوص تیسری دنیا کے معاشرے کا فرد آتا ہے لیکن

پروفیسر سید محمد عقیل نے اپنے مضمون ''نئی غزل کا بدلتا ہوا رنگ'' (فکر وفن کے آئینے میں) میں واقعہ کربلا کی اشاریت میں خود کلامی دیکھتے ہیں اور انصاف نہ ملنے کے خلاف احتجاج کی آواز سے محروم دیکھتے ہیں حالانکہ واقعہ کربلا مکمل احتجاج، ظلم وستم اور استعماری طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی، حق پرستی اور حق گوئی سے عبارت ہے۔ مابعد جدید غزل میں سانحہ کربلا کی اشاریت کا دخول کسی خارجی دباؤ کے باعث نہیں ہے بلکہ آج ہر انسان کے اندر ایک کربلا بپا ہے۔ کربلا میں اخلاقی و روحانی اقدار، رشوں کی پاسداری، دوستوں کے ساتھ حسن سلوک اور دیگر ساری انسانی قدریں اپنے معراج پر نظر آتی ہیں لیکن معاصر عہد میں یہ سب کچھ ختم ہو رہا ہے اور انسان کربلائے عصر میں یکہ وتنہا ہے اور اس کے پاس انسانی اقدار کا سرمایہ بھی نہیں ہے تو ایسے میں سانحہ کربلا کی اشاریت غزل میں داخل ہو رہی ہے تو حیرت کی بات نہیں ہے اور دوسری طرف انسان جب اپنے اردگرد دیکھتا ہے تو ہر شہر کوفہ وشام نظر آتا ہے۔ ایسے میں شاعر موجودہ صورتحال کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتا ہے اور احتجاج بھی کرتا ہے اور مستقبل میں موجودہ صورتحال کی تبدیلی کی بشارت بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمہاری شکل جانی پہچانی ہوئی
وہ مرحلہ ہے کہ اب سیل خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لئے
عرفان صدیقی

اب بھی توہین اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے
افتخار عارف

سیاہ مکر و ریا ساحلوں پہ خیمہ زن
غریق دجلۂ خوں ہیں شجاعتیں ساری
اسعد بدایونی

تمام وسعت صحرائے تشنگی میری
تمام سلسلۂ دجلہ و فرات مرا
عشرت ظفر

ہم خاک ہوئے بھی تو رہے خاک شفا ہی
مٹی میں ملانے کا ہنر کام نہ آیا
خالد عبادی

کوئی حسین بسا ہے ضرور اس دل میں
صبا میں چاروں طرف اپنی کربلا دیکھوں
صبا اکرام

نوک نیزہ پہ کبھی، طشت رعونت میں کبھی
ہر تماشے کے لیے میرا ہی سر رکھا گیا
رفیق الزماں

> سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ نئی غزل میں اہمیت تو دی جارہی تھی تاہم مابعد جدید غزل میں ایک اہم رویے کی صورت اختیار کر گیا ہے کیونکہ مابعد جدید غزل میں اس موضوع کا اظہار بطور علامت ہوا ہے۔ مابعد جدید غزل گو شعراء میں عرفان صدیقی اور افتخار عارف نے خصوصیت کے ساتھ تلمیحات کربلا کو بطور استعارہ مسلسل اور مستقل مزاجی سے استعمال کیا ہے۔ (جیسا کہ اوپر کی گئی گفتگو سے واضح ہے) واقعہ کربلا جابر حکومت کے خلاف ایک طرح کا احتجاج کرتی ہے اس لئے کربلا اور اس کی تعلیقات کے استعمال سے مابعد جدید شعری اظہار میں احتجاج کی کیفیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ کیسا شہر ہے کیسی ہے سرزمیں اس کی
جہاں کی خاک پلٹتا ہوں سر نکلتا ہے
صدیق مجتبیٰ

تیروں کی بوچھار بھی سہنا ہے مجھ کو
میرے ہاتھ میں ہے مشکیزہ پانی کا
شاہد میر

آخری شعر میں امام حسینؑ اور کربلا کی تلمیحات سے اپنے عہد کی صورتحال کو بیان کیا ہے۔ صبا اکرام اپنے چاروں طرف کربلا جیسی صورتحال کے باوجود اپنے اندر امام حسینؑ کو بسا ہوا یعنی بشارت حق اور انتظار صبح دیکھ رہے ہیں۔ اس شعر میں صبا اکرام نے رجائیت اور صبح امید کی ترجمانی کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان شعروں کی اشاریت، الفاظ کی بیرونی آواز اور علامت لے کر اندرونی کرب کی مظہر بنتی ہے مگر اس کرب میں محرومی اور یاس کے بجائے ایک طرح کی صلاحیت اور احتجاج کی کیفیت ملتی ہے۔

اس مختصر جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سانحۂ کربلا اور اسکے متعلقات کا استعمال ہر عہد کی غزل میں ہوتا رہا ہے۔ جدید غزل میں پہلی بار یہ علامتیں اپنے لغوی، تاریخی اور کاروباری معنی سے نکل کر معاصر عہد کی ہولناکیوں اور دہشتناکیوں کی ترجمان ہوئیں۔ تاہم مابعد جدید غزل میں یہ علامتیں ایک تخلیقی رجحان کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

پہلی بار مابعد جدید غزل گو شعرا نے ان علامتوں کے ذریعے موجودہ صورتحال کے خلاف نہ صرف احتجاج کیا بلکہ اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی دیا، نیز مستقبل کی بشارت بھی دی۔ ہمایوں ظفر نے ''ہوائے دشت ماریہ'' کے دیباچے میں عرفان صدیقی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے جن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے در اصل یہ علامات کربلا کے تناظر میں پوری مابعد جدید غزل کی خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ''عرفان صدیقی کی شاعری میں علامات کربلا کا تخلیقی استعمال نہ صرف یہ کہ ہمارے عہد کے درد و کرب کو پوری طرح نمایاں کرتا ہے بلکہ آئندہ زمانوں کی بشارت بھی دیتا ہے۔''

❑❑❑

نوحہ گوئی کا تاریخی و تنقیدی تجزیہ

شاہد کمال
نزد سینٹ جانس انٹر کالج، مفتی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9839346181

رثائی ادب کی قدیم اور حساس ترین صنف سخن نوحہ پر گفتگو کرنے کا مقصد اپنے اعتقاد کے اظہار سے زیادہ اپنے ادبی یقین کی آسودگی ہے۔ رثائی ادب میں مرثیہ اور سلام کی طرح نوحہ بھی ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔ علمائے ادب نے مرثیہ اور سلام کی ادبی افادیت کے پیش نظر اس کے کچھ اصول وضوابط وضع کئے ہیں اور بیشتر شعرا نے ان اصناف سخن میں خوب خوب طبع آزمائی بھی کی اور انیسؔ و دبیرؔ جیسے عظیم شعراء نے اس صنف سے صرف نظر نہیں کیا۔

نوحہ پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ عزائیہ شاعری کی دو اہم صنف سخن ''روایت'' اور ''ماتم'' کا بھی ضمنی طور سے تذکرہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

''روایت'' مثنوی کی طرح ایک طویل نظم ہوتی ہے جس میں واقعات کربلا کو حکایتی انداز میں نظم کیا جاتا ہے۔ مثنوی اور ''روایت'' میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ مثنوی میں مطلع کے بعد کے تمام اشعار مطلع کے قوافی کے پابند نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے برخلاف ''روایت'' میں ہر دوسرے شعر میں مطلع کے قافیہ کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔

''ماتم'' ''روایت'' کی طرح نوحہ کی ایک الحاقی نظم ہے جس میں شاعر کربلا کے کسی ایک شہید کے واقعات و حالات کو تسلسل کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔ نوحہ میں اس طرح کی پابندی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔

ہمارا اصل مقصود نوحہ پر گفتگو کرنا ہے آج جب ہم کسی نقاد یا دانشور سے نوحہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو اس صنف کے حوالے سے وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پہلی بات تو یہ کہتے ہیں کہ دیگر اصناف سخن کی طرح اس میں وہ شعری محاسن یا ادبیت نہیں پائی جاتی کہ جس کی وجہ سے اسے ادبی زمرے میں رکھا جائے۔ مزید استفسار کی صورت میں اس کا منطقی جواز یہ پیش کیا جاتا ہے، چونکہ اس کا موضوع آہ و بکا ہے اور یہ صنف محض اظہار حزن والم سے متصف ہے لہذا موضوع و مواد کے اعتبار سے بھی اس کے دامن میں وسعت کا امکان بہت کم پایا جاتا ہے یا دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ ابھی اس صنف کے تعلق سے ماہرین ادب نے زیادہ کچھ لکھا بھی نہیں ہے۔

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ نوحہ سے متعلق رثائی ادب میں ایسا کچھ کام نہیں ہوا ہے۔ لیکن کیا؟ اس طرح کا جواز کسی صنف سخن کے استرداد کے لئے صحیح ہے۔؟ اگر اس طرح کی توضیحات کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ بات وا شگاف ہوتی ہے کہ رثائی ادب کے حوالے سے معاصر عہد کے نقادوں اور دانشوروں کا یہ موقف کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کے نظریاتی توضیحات کی روایت بہت پرانی رہی ہے۔ فی زمانا فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ ایک نظریہ تھا جو آج ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لہذا اس طرح کے غیر ادبی رجحانات کو محض ذہنی پسماندگی سے ہی تعبیر کیا جانا چاہیئے۔

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ نوحہ سے متعلق رثائی ادب میں ایسا کچھ کام نہیں ہوا ہے۔ لیکن کیا؟ اس طرح کا جواز کسی صنف سخن کے استرداد کے لئے صحیح ہے۔؟ اگر اس طرح کی توضیحات کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ بات وا شگاف ہوتی ہے کہ رثائی ادب کے حوالے سے معاصر عہد کے نقادوں اور دانشوروں کا یہ موقف کوئی نیا نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کے نظریاتی توضیحات کی روایت بہت پرانی رہی ہے۔ فی زمانا فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ ایک نظریہ تھا جو آج ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لہذا اس طرح کے غیر ادبی رجحانات کو محض ذہنی پسماندگی سے ہی تعبیر کیا جانا چاہیئے۔

اس لئے کہ اتہام و ایراد کا یہ سلسلہ محض ''نوحہ'' سے متعلق ہی نہیں رہا ہے۔ بلکہ ابتدا میں مرثیہ جیسی صنف کو بھی یہ کہہ کر معتوب و مطعون کیا گیا کہ یہ صنف محض رونے رلانے اور حصول ثواب تک ہی محدود ہے، یہ ایک ایسی بحث ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے یہ سلسلہ آج بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ جاری وساری ہے جدید وقدیم کی یہ بحثیں بحث نہ رہ کر ایک قضیہ کی صورت اختیار کر گئیں ہیں جو حل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔

لیکن میں یہاں ایک بات ضرور کہوں گا کہ ادبی کفالت میں پرورش پانے والے اس طرح کے یتیمانہ نظریات اپنے اجتماعی اقلیت کے باوجود ادب

میں کسی فرد واحد کی عقلی مجہولیت سے زیادہ اہمیت و حیثیت نہیں رکھتے اس بحث کو مزید طول دینے سے بہتر ہے، کہ اس کے رموز وعلائم کو سمجھنے کے لئے بزرگ ناقدین کی تحریروں کا سہارا لیا جائے۔

پروفیسر آل احمد سرور کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''...یہ بھی ہوا کہ مغرب میں سیکولرازم کے فروغ نے مذہب کو کچھ فرسودہ اور دقیانوسی قرار دیدیا اور مذہبی شاعری کو بھی خواہ کیسی اچھی شاعری کیوں نہ ہو زندگی سے فرار یا نشے اور خجالت کی شاعری کہہ کر اُسے آج کی زندگی اور اس کے تقاضوں سے بے گانہ سمجھنے کی لے بڑھنے لگی۔ آزادی سے کچھ قبل کی تنقید میں اقبال کی شاعری جس کا سرچشمہ مذہب واخلاق ہے اسی روش کا نشانہ بنی تھی۔ لیکن جیسے جیسے ادب کی مخصوص بصیرت کا عرفان بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے شاعری اور اس کی عظمت کے لئے کسی مخصوص سیکولر نظام یا کسی مخصوص مذہبی یا اخلاقی نظام کی چھاپ ضروری نہیں سمجھی جاتی۔''

(مضمون ''انیس کی شاعرانہ عظمت'' آل احمد سرور، مشمولہ ''انیس شناسی'' مرتبہ گوپی چند نارنگ)

پروفیسر آل احمد سرور کا یہ نظریہ ادب کی کسی صنف کے پرکھنے کے لئے ایک صحت مند رویہ کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ بات اپنے تمام عقلی تلازمات کے مطابق بھی ہے اس لئے کہ کسی اصناف سخن کے ادبی معیار کا جائزہ اس کے مذہبی یا مسلکی سطح سے بلند ہوکر ادبی بصیرت کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ اگر اس طرح کے منصوبہ بند نظریات کی بنیاد پر کسی تخلیق کے پرکھنے اور جانچنے کے عمل کو جائز اور درست مان لیا جائے تو دنیا کا کوئی ادب معرض استرداد سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اس طرح کے غیر اعتذاری وجوہات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نوحہ کے حوالے سے صدیوں سے چلا آرہا یہ مصلحتی جمود اب ٹوٹنا چاہئے اور ایک صحتمندانہ ادبی ماحول میں ایک نئی بحث کا سلسلہ شروع ہو۔ تاکہ اُس سچائی کا انکشاف ہو سکے جس حقیقت پر شعوری طور پر ایک پردا ڈال دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ علمائے ادب کی یہ پراسرار خاموشی بڑی مصلحت انگیز محسوس ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر جب رثائی ادب کی اہم ترین صنف سخن مرثیہ کا تاریخی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو اس کے ابتدائی نقوش عربی ادب کے قدیم آثار سے ہی دریافت ہوتے ہیں اور محققین نے اس کی تاریخی نشاندہی بھی کی ہے، جس کا تذکرہ بیشتر کتابوں میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

عربی ادب میں مرثیہ اور نوحہ کی معروضی بحث کافی تفصیل طلب موضوع ہے ہم یہاں پر صرف نوحہ اور مرثیہ کی تاریخی نشاندہی مولفین ومورخین مراثی کے اس قول کے تناظر میں کریں گے جس پر بالاتفاق رائے تمام علمائے ادب کا اجماع ہے۔

جب مرثیہ کی تاریخ بیان ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے، کہ جتنی قدیم انسانی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم مرثیہ کی بھی تاریخ ہے جیسا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

''مرثیہ کو دنیا کی قدیم ترین نسل انسانی کی مشترک صنف کلام قرار دینا شاید غلط نہ ہوگا۔''

مرثیہ کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے۔

''حضرت ہابیل علیہ السلام کی موت پر حضرت آدم علیہ السلام کی آنکھوں سے چھلکنے والا آنسو شاید وہ پہلا خاموش مرثیہ ہے جو فطرت نے ایک دردمند باپ کے صفحۂ عارض پر لکھا۔''

(اردو میں شخصی مرثیے کی روایت، ڈاکٹر عابد حسین حیدری)

اس طرح مرثیہ کا تاریخی خمیر حضرت ہابیلؑ کی شہادت پر جناب آدمؑ کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں سے ہی تیار ہوتا ہے۔ اصل میں مرثیہ کی یہی تاریخ نوحہ کے تاریخی وجود کا اثبات ہے اور مرثیہ اور نوحہ کے درمیان یہی ایک امتیازی فرق بھی۔ اس لئے کہ مرثیہ محض کسی کی موت پر اظہار تاسف وتاثر کا نام ہے۔ لیکن اس کے برعکس کسی شخص کی موت پر آنسو بہانے اور سروسینہ پیٹنے کا نام ہی نوحہ نہیں بلکہ ذات و کائنات کے انفرادی واجتماعی دردوغم کے اظہار کا نام نوحہ ہے۔ شاید اسی لئے حضرت حواؑ کے ہجر میں حضرت آدمؑ کی آنکھوں سے نکلنے والا آنسو کا پہلا قطرہ فطرتِ انسانیت کا سب سے پہلا نوحہ قرار پایا۔ اللہ کے برگزیدہ نبی جناب عبدالغفارؑ کی اپنی امت کی نجات اور ہدایت کی فکر میں مسلسل آہ وزاری ونوحہ خوانی اللہ کو اتنی پسند آئی کہ اپنے اس نبی کو ''نوح'' کے اعزازی لقب سے یاد کیا۔ بالکل اسی طرح سے حضرت یوسفؑ کے فراق میں جناب یعقوب پیغمبر کی مسلسل نوحہ خوانی اور شدت گریہ سے ان کی آنکھوں کی پتلیوں کا سفید ہوجانا یہ ایک نبیؑ کا مرثیہ نہیں بلکہ ایک مغموم ومحزون باپ کا نوحہ تھا جو آج بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے اور صبح قیامت تک ہر صاحبان دل سے دردوغم کا خراج وصول کرتا رہے گا۔

ہمارے بیشتر محققین وناقدین مرثیہ کے جغرافیائی تمدن کا نقطہ اول عرب کے قبائلی تہذیب کو ہی قرار دیتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقی دریافت کے مطابق۔

''عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے، شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اور یہی ہونا چاہئے تھا عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی۔۔۔''

(موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ ص ۳۸، مرتبین پروفیسر سید مجاور حسین رضوی، ڈاکٹر سید علی حیدر)

لیکن اس کے برخلاف نوحہ کی جغرافیائی تاریخ کی دریافت جناب عیسیٰؑ سے چار ہزار سال قبل

ہوچکی تھی ۔جیسا کہ سر جمیس جان فریزر اپنی کتاب ''گولڈن باڈ'' میں تحریر کرتا ہے۔

''مقامی روایات کے بموجب جس کی پلوٹرچ بھی تائید کرتا ہے، جب ایسس (isis) کو اپنے شوہر اوسائرس (osiris) کی لاش ملی تو وہ اپنی بہن نیفاطیس کے ساتھ لاش کے برابر بیٹھ گئی نوحہ وشیون کرنے لگی یہ بین بعد کے زمانے کے لئے متوفی کے لئے ایک عام نوحہ کی صورت اختیار کر گیا۔''

(مجلہ انجم کراچی، مضمون نگار افضال حسین نقوی ''مرثیہ اور انیس'' مطبوعہ نقوش لاہور دسمبر ۱۹۷۰ء)

یہاں پر محض نوحہ اور مرثیہ کی تاریخی قدمت پر بات کرنا مقصود نہیں ہے۔ مسئلہ اس بات کا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جو نوحہ کے تاریخی استناد میں حارج ہوئے، جس کی وجہ سے ہمارے محققین کہیں نہ کہیں نوحہ اور مرثیہ کی دریافت میں غیر شعوری طور پر تحقیقی اشتباہ کے شکار ہوگئے۔ جس کی وجہ سے نوحہ اپنی تاریخی شناخت اور ادبی وقار سے آج تک محروم رہا ۔شاید اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ محققین نے مرثیہ کی تاریخی استناد کی ترتیب و تنظیم کا کام مرثیہ کی لغوی یا اصطلاحی تعریف کی روشنی میں کم بلکہ انیسؔ و دبیرؔ جیسے قادر الکلام شاعر کی شاعرانہ مہارت اور مرثیہ کے عوامی مقبولیت سے مرعوب ہو کر کی ہے۔ جس کی وجہ سے نوحہ جیسی قدیم صنف سخن تحقیقی حق تلفی کا شکار ہوگئی ۔اس نقطہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے، کہ ہم اس عہد کا جائزہ لیں جہاں سے ہماری اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ہماری اردو شاعری کا ابتدائی منبع و ماخذ دکن ہے، جہاں اردو کی شاعری اپنے قد و قامت کے ساتھ نمو پذیر ہوئی اس لئے دکن ہماری اردو شاعری کا مرجع اول قرار پایا۔ علامہ شبلی نعمانی ''موازنہ انیسؔ و دبیر'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولیؔ سے ہوئی ولیؔ نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی ،لیکن اس کے کلام میں مرثیہ کا پتہ نہیں لگتا یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سوداؔ اور میرؔ سے پہلے مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا۔''

مسیح الزماں نے شبلیؔ کی اس تحقیق پر ایراد کیا ہے وہ کہتے ہیں:

''کربلا کے واقعات سے متعلق مثنوی ولی دیلوری کی ہے۔ مولانا شبلیؔ کو تخلص ایک ہونے کی وجہ سے دھوکہ ہوا ہے۔''

(موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ مرتبین پروفیسر مجاور حسین رضوی ڈاکٹر سید علی حیدر، حاشیہ، ص ۵۵)

پروفیسر مجاور حسین کی مذکورہ کتاب کے اسی حاشیہ کا یہ اقتباس بھی قابل توجہ ہے:

''دکن میں مرثیہ کا نقطہ آغاز حضرت شاہ اشرف بیابانی کی نوسرہار ۱۵۰۳ء ہے اس کے بعد حضرت برہان الدین جانم کا نام نامی آیا ہے۔''

سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں، ان کے دیوان میں دیگر اصناف سخن کے ساتھ نوحے بھی درج ہیں نوحہ گوئی کا یہ سلسلہ محض سلطان قلی قطب تک ہی نہیں تھا بلکہ یہ اشرف، وجہی ،غواصی ،نصرتی ،نوری ،شاہی ،کاظم ،مراز، مقیمی ،ہاشمی وغیرہ نے بھی نوحے کہے ہیں۔

ان تاریخی دستاویزوں کی چھان بین سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتدائی عہد کے شعرا، سے میرؔ و سوداؔ کے عہد تک کے شعرا کے وہ تمام رثائی کلام جو واقعات کربلا سے متعلق تھے اسے بغیر کسی منطقی نشاندہی کے مرثیہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے مرثیہ کی تاریخی شناخت اور نوحہ کی ادبی پہچان مشکوک سی ہوگئی اور جو تحقیقی اشتباہ مرثیہ کی ابتدائی دریافت کے دور میں غیر شعوری طور پر ہمارے ادب میں سرایت کر گئی تھی وہی آج ایک نفسیاتی الجھاؤ اور تذبذبانہ رویہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ محققین نے مرثیہ کی دریافت کا عمل اور اس کی تحقیقی نشاندہی کی لغوی تعریف کی بنیاد پر انجام دی جس کے سبب نوحہ اور مرثیہ میں التباس پیدا ہو گیا اور اس التباس میں بنیادی نقصان نوحہ کا ہوا جس کی وجہ سے نوحہ اپنی ادبی مرکزیت سے کٹ سے گیا۔ اس تحقیقی تسامح کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ نوحہ اور مرثیہ کا ان کی مروجہ تعریف کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

مرثیہ کی لغوی تعریف:

مرثیہ عربی لفظ ہے اس کا مصدر رثا ہے جس کے لغوی معنی یہ ہیں'' مردے کی صفت ،مردے کی تعریف، وہ نظم یا اشعار جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اور مصیبتوں کا ذکر ہو''۔

(نور اللغات، ج ۴ ص ۲۳۲)

مرثیہ وہ نظم ہے جس میں مردے کے اوصاف بیان کئے گئے ہوں یا وہ نظم جس میں شہدائے کربلا کے مصائب اور شہادت کا ذکر ہو

(فیروز اللغات اردو)

نوحہ کی تعریف:

نوحہ بھی مرثیہ کی طرح عربی لفظ ہے جس کے معنی صیحہ کرنے کے ہیں (یعنی بلند آواز سے گریہ کرنے کو کہتے ہیں) ماتم کرنا لاش پر چلا کر رونا۔

مرثیہ اور نوحہ اپنی ظاہری ساخت کی بنیاد پر دو الگ الگ لفظ ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود معنوی سطح پر دونوں کا مقصود ایک ہی ہے یعنی مردے کی لاش پر گریہ کرنا رونا چلانا سینہ کوبی کرنا وغیرہ

اب اگر اس تعریف کے تناظر میں غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوحہ اور مرثیہ کا استعمال محض لفظی مترادفات کے طور پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں معنوی ترادف بھی پایا جاتا ہے ۔اب اگر ایسی صورت میں نوحہ اور مرثیہ کی مذکورہ تعریف کی بنیاد پر

اس کے تاریخی تشخص کی بات کی جائے تو اس میں کوئی امتیازی افتراق نہیں رہ جاتا لہذا ایسی صورت میں مرثیہ کو نوحہ اور نوحہ کو مرثیہ کہا جائے تو اس سے انکار کا کوئی معقول جواز بھی نہیں رہ جاتا۔ لیکن اگر اس کے موضوع کی بات کریں تو دونوں کا عمومی موضوع ایک ہے۔ اگر ہیت کے اعتبار سے دیکھیں تو نوحہ اور مرثیہ کے درمیان ہیت کے اعتبار سے بھی کوئی امتیازی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر مرثیہ دو بیتی، مثلث، مربع، مخمس، اور مسدس کی ہیت میں کہے جاتے رہے ہیں تو نوحہ بھی مرثیہ کی طرح مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں کہے گئے ہیں اور کہے بھی جارہے ہیں۔ مرثیہ اور نوحہ اپنی مجموعی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے تو ایک ہیں لیکن نوحہ اور مرثیہ میں اگر کوئی امتیازی فرق ہے تو صرف اجزائے ترکیبی کا جسے ''چہرہ'' ''گریز'' ''رخصت'' ''آمد'' جنگ'' شہادت'' اور بیان مصائب وغیرہ یہی وہ چیز ہے جو مرثیہ کو نوحہ سے ممیز کرتی ہے اور یہ بہت بعد کی ایجاد ہے شاید میر ضمیر جیسے استادِ سخن نے نوحہ اور مرثیہ کے درمیان ایک خط امتیاز پیدا کرنے کے لئے مرثیہ کو ایک نئی شکل دی تھی میر ضمیرؔ کے اس مجددانہ اقدام سے پہلے مرثیہ کا اپنا کوئی انفرادی وجود متعین نہیں تھا جسے وثوق کے ساتھ مرثیہ کہا جاسکے۔ لہذا اگر اس بنیاد پر ہم مرثیہ کو نوحہ کی توسیعی شکل کہیں تو یہی زیادہ مناسب اور معقول معلوم ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کریں۔

''مرثیہ کو صرف کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کا دہراتے رہنا۔۔۔ شاعری کو محدود کرنا ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۲۳۷)

پہلی بات تو یہ کہ مولانا کا یہ نظریہ کہ تمام عمر اسی ایک مضمون کا دہراتے رہنا شاعری کا محدود کرنا ہے۔ دراصل کربلا کی معنوی وسعتوں سے ناواقفیت پر دلیل ہے کربلا کا مضمون تمام کائنات انسانیت کی سب سے اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں سے عبارت ہے جسے کے تسلسل اور ادسے نئے نئے مفاہیم و معنی کا جنم ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری کربلا کے اس آفاقی نصاب سے نو بہ نو علامات و استعارات وضع کرتی رہتی ہے۔

اس اقتباس سے مولانا کا نظریاتی منشور بالکل واضح اور روشن ہے جو اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ مولانا مرثیہ کے بنیادی اتصاف اور عمومی رجحان کو واقعات کربلا سے ہٹ کر مرثیہ کو ایک نئے عنوان سے متعارف کرانے کی ایک شعوری کوشش کر رہے تھے جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے مولانا نے واقعات کربلا سے ہٹ کر مرثیہ کا ایک نیا تعارف شخصی مرثیہ کے حوالے سے کیا اور انھوں نے اپنے اس اقدام کے عملی جواز کے ثبوت میں اپنے ماسبق شعرا کی وہ تمام رثائی تخلیقات جو اپنے ذاتی غم کے اظہار یا دوسرے حادثاتی واقعات اور سانحہ ارتحال سے متعلق تھیں اسے شخصی مرثیہ کے نام سے پیش کیں۔ مولانا کے اس اقدام سے ادب کا جو فائدہ ہوا اس سے بحث نہیں لیکن ایک نقصان ضرور ہوا کہ نوحہ ایک بار پھر اپنی اصل شناخت سے محروم ہوگیا کتنا اچھا ہوتا کہ اگر شخصی مرثیہ کو شخصی مرثیہ کے بجائے شخصی نوحہ کہا جاتا۔

ہندوستان میں مرثیہ نگاروں نے ہندوستانی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور عقیدت و اعتقاد کی زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔ کرداروں کا لب ولہجہ، نفسیات، حرکات وسکنات، محاورے، طرز تکلم، حفظ مراتب، طرز تخاطب ایسے رنگ پیش کیے ہیں کہ خالص عربی کردار سراسر ہندوستانی فضا کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ جدید مرثیہ نگاروں نے انہیں کرداروں کو عوام کے پیچیدہ مسائل سے ملا کر مرثیے کا موضوع کائنات گیر بنادیا جہاں مرثیے کے کردار عوام سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قدیم و جدید نوحے جن کو بینیہ و تبلیغی نوحے کہا جاتا ہے ہندوستانی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرنے میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔

نوحہ کسی مخصوص ہیت کا پابند نہیں ہوتا اور نہ کسی خاص واقعات و شخصیات کا نوحہ اپنے ذاتی جذبہ غم کے اظہار میں کسی مسلکی یا مذہبی رسوم و قیود کا پابند بھی نہیں ہوتا لہذا رثائی ادب میں دیگر اصناف سخن کی طرح نوحہ کو محض کربلا سے مخصوص کر کے نہیں دیکھنا چاہیے اس لئے کہ نوحہ ہر انسان کے اپنی ذاتی غم والم کے اظہار کا بھی نام ہے۔ وہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ انسان کربلا کے اس آفاقی غم کے مقابلے میں اپنے ذاتی غم کو کس طرح سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اگر وہ کربلا کے غم کو اپنے غم سے زیادہ عظیم سمجھتا ہے تو اس کے اظہار کے لئے اسی کی ادبی اختصاص اور مذہبی جواز کی ضرورت نہیں ہے اور جہاں تک حصول ثواب کا مسئلہ ہے تو یہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی غم انسان کے اندر پائے جانے والے سب سے حساس جذبہ کا نام ہے اور اس کی معنویتی کائنات میں کافی وسعت پائی جاتی ہے اس لئے کہ گریہ وزاری کے تعلیقاتی عوامل انسانی زندگی کے مختلف شعبے پر محیط و بسیط ہوتے ہیں۔

مرثیہ کے مقابلے میں نوحہ زیادہ تفصیل طلب موضوعات کا متحمل نہیں ہوتا اس لئے نوحہ کا آغاز نوحیت سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی نوحیت پر ہی ہوتا ہے نوحہ کا ایک مخصوص دائرہ عمل ہے چونکہ انسان فطری طور پر اپنے اظہار غم کے لئے کسی طرح کی فضا سازی اور ماحول آرائی کا اہتمام و انتظام نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر پیدا ہونے والی ہیجان انگیز المیاتی کرب کا برجستہ اظہار چاہتا ہے لہذا مرثیہ کی طرح نوحہ تمام تر تصنعات اور تکلفات سے شعوری طور پر گریز کرتا ہے۔ نوحہ گوئی کا فن نہایت ہی مشکل فن ہے اس میدان میں شاعر کو ایک مخصوص دائرہ کے اندر رہ کر تخلیقی ہنرمندیوں اور مخصوص تکنیک کے ذریعہ اپنے اند ر پیدا ہونے والی ہیجان انگیز کرب کو اپنے جذبات میں تحلیل کر کے اپنی مخصوص لفظیات کے ذریعہ اس کی

ترسیل کرتا ہے جس کا اثر اس کے سامع پر کچھ اس طرح ہوتا سے ہوتا ہے کہ وہ گریہ وزاری اور سینہ کوبی کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

نوحہ سے متعلق بیشتر ناقدین کا یہ اغلب رجحان ہے کہ نوحہ نسائی زبان میں جذبہ غم واندوہ کے اظہار کا نام ہے۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نوحہ گوئی میں نسائی جذبات کی نمائندگی مردوں کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے اس کا ایک نفسیاتی اور طبیعاتی پہلو بھی ہے چونکہ عورتیں مردوں کے مقابلے زیادہ جذباتی اور حساس ہوتی ہیں لہذا غم واندوہ ان کی طبیعت پر بہت جلد اثر انداز ہوتا ہے اور ایک عورت جتنی شدت کے ساتھ غم کو محسوس کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ جذباتی انداز سے اس کیفیت غم کا ظہار بھی کرتی ہے۔ مرثیہ کی طرح ہی ہندوستانی عورت کے جذبات کی یہ مختلف کیفیتیں جو آپ نے مرثیوں میں پڑھیں ہیں وہ بعینہ نوحوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔عراق کی سرزمیں کربلا میں رونما ہونے والے واقعات کو اگر باریکی بینی سے دیکھیں گیں تو آپ یہ محسوس کریں گیں کے ایک ماں اپنے بچے کو میدان قتال میں بھیجنے کے لئے کس طرح تیار کرتی ہے اور کیا نصیحتیں کرتی ہیں یہ موضوع بہت ہی حساسیت سے عبارت ہے۔معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں جب کربلا کی کسی شہید کی ماں کے بیٹے کی لاش خیمے میں آتی ہے تو اس کے اظہار حزن والم کا دردانگیز منظر کس طرح بیاں کرتی ہیں اس کو سننے کے بعد دل میں ایک عجیب کرب والم انگیزیت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔جو انسان کے اندرون کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔مجموعی طور پر کسی واقعہ کے جزیئات کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی واقعہ کے اہم پہلوؤں کو نوحوں میں ضرور بیان کی جا سکتا ہے۔پروفیسر اطہر رضا بلگرامی کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''نوحوں کا ہندوستان ایک جامع مکمل اور متحرک ہندوستان ہے جہاں آپ کو ایک طرف انیسؔ و دبیرؔ کا اودھ کی تہذیب و معاشرت میں رچا بسا ہندوستان نظر آئے گا تو دوسری طرف گنگا جمنا ہمالیہ ،کھیت کھلیان، ندیوں ، باغوں وفصلوں کو سمیٹے ہوئے ہندوستان ملے گا۔ یہاں اگر ایک طرف حفظ مراتب ،طرز تخاطب کی تہذیب ہے تو دوسری طرف سادھو، سنتوں اور صوفیوں کے اپدیش بھی ہیں۔ یہاں کہیں سنت کبیر کی آواز اور میراؔ کے بھجن گونجتے ہیں تو دوسری طرف انقلاب وللکار بھی سنائی دیتی ہے۔۱۹۴۱ء میں حسینی یادگار کمیٹی نے تبلیغ حسینی کے سلسلے میں جو ملک گیر کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں سب سے اہم کام واقعہ کربلا اور حسینی پیغام کو ہندوستانی عوام تک پہونچانا تھا۔ چونکہ نوحہ کسی مخصوص طبقے سے نہیں عوام سے مخاطب تھا اس لئے وہ انہیں کی زبان ولب ولہجہ میں مخاطب ہوا ۔انہیں کی رسم ورواج واعتقادات کا نمائندہ بنا اور انہیں کے جذبات کی عکاسی کرتا ملا۔ اس لئے نوحوں نے مقامی زبان ولب و لہجہ کو اپنایا۔انہیں کے زبان زد محاورے استعمال کئے اور اس وقت کے مقبول ومعروف عوامی شعراء مثلاً اکبرؔ الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں کا سہارا لیا۔سنت کبیرؔ ،تلسی داس ، میرابائی کے مقبول عام کلام کا رنگ اپنایا اور اقبال کی ہر دل عزیز نغموں کا چولا پہنا۔انیسؔ و دبیرؔ اور ان کے معاصرین نے اپنے مرثیوں میں کبھی عوام کی نمائندگی نہیں کی۔کبھی ہندوستانی عوام کو مخاطب نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج گجراتی ، کشمیری، ڈونگری،سندھی ، پنجابی اور مختلف شمالی ہندوستان کی زبانوں میں نوحے تو بہت مل جائیں گے جو اپنے اپنے علاقوں میں مقبول ہیں لیکن مرثیوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔اور جو ہیں بھی وہ اتنے مقبول عام نہیں۔مرثیوں کے مقابلے میں نوحوں کا ہندوستان بہت جامع ، وسیع اور بہت منفرد اور متحرک نظر آتا ہے۔'

(نوحہ رثائی ادب کا اہم ستون اور قومی یکجہتی کا آئینہ)

یہ بات بالکل درست ہے کہ نوحہ گوئی دماغ سوزی سے زیادہ جگر سوزی کا کام ہے جیسا کہ امید فاضلی تحریر کرتے ہیں۔

''صنف نوحہ گوئی ایک مشکل صنف سخن ہے۔اس میں شاعر کو اپنا پتہ پانی کر پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ کسی کی آنکھ سے آنسو اور دل سے آہ نکلوا سکتا ہے''

(مجلہ ''ایک آنسو میں کربلا'' اسلام آباد)

اردو میں نوحہ کا آغاز دکن سے ہی ہوا ہے، ولی دکنی کے کلام میں رثائی کلام پائے جاتے ہیں ،لیکن مرثیہ کی تاریخ کے محققین اور مولفین نے ان کے اس رثائی کلام کو مرثیہ کے ہی زمرے میں رکھا ہے جب کہ میرے نظریہ کے مطابق یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ مرثیہ کے محققین نے دکن کے شعرا کے جن کلام کو مرثیہ سے تعبیر کیا ہے دراصل وہ مرثیہ نہیں نوحہ ہی ہے چونکہ ان کلام کو اگر موجودہ رثائی ادب کی صنف نوحہ سے تقابلی جائزہ کریں گے تو وہ نوحہ کے تمام تلازمات کی ہی عکاسی کرتے ہیں لیکن بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ مرثیہ کی ہیت میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور معاصر عہد میں مرثیہ کے تلازمات اور اس کے ہیت متعین ہو چکی ہے، لہذا اس بنیاد پر ان تمام کلام کو جو ابتدائے اردو عہد کی اساسی دور میں جسے مرثیہ سے تعبیر کیا وہ دراصل نوحہ ہی ہے۔محققین مرثیہ نے ،مرثیہ کے باضابطہ جس عہد کی نشاندہی کی ہے وہ 1503 عیسوی میں شاہ اشرف بیابانی کی ''نوسرہار'' میں موجود رثائی کلام کو مرثیہ کہا ہے اور برہان الدین جانم کے کلام کو بھی مرثیہ کہا ہے، حالانکہ وہ مرثیہ نہیں نوحہ ہے۔اسی طرح سے مرزا برہانپوری اور ہاشمی وغیرہ نے بھی بڑے پر اثر نوحہ تخلیق کئے ہیں۔لیکن ان سب میں قلی قطب شاہ

(۹۷۳ھ تا ۱۰۲۰ھ) کو ان تمام نوحہ گو شعرا کا سرخیل کہا جاتا ہے۔لیکن نصیر الدین ہاشمی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''شیخ اشرف'' نے ''دہ مجلس'' کے عنوان سے ایک بہت ہی مفصل نظم لکھی ہے جس میں 1800 راشعار موجود ہیں ،ان اشعار میں بڑے تفصیل کے ساتھ واقعات کربلا کو نظم کیا گیا۔

(دکن میں اردو:ص ۲۷۳)

لیکن جب ہم تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو بیشتر محققین و مولفین مرثیہ کی اصل تاریخ کو لے کر تذبذبانہ رویہ کے شکار نظر یہ دو چار نظر آتے ہیں ۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی سے ہوئی ولی نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی لیکن اس کے کلام میں مرثیہ کا پتہ نہیں لگتا یہ معلوم نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کس نے کی۔۔۔۔''

اس اقتباس سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مرثیہ کی تاریخ کی دریافت میں کوئی یقینی امکان کی صورت نظر نہیں آتی۔لیکن نوحہ کی باضابطہ تاریخ اردو شاعری کے ابتدائی نقوش میں بہت واضح دکھائی دیتی ہے۔لہذا ابتدائے اردو شاعری کو نوحہ کی ابتدائی تاریخ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔اسی طرح سے جیسے جیسے اردو زبان اپنے مرحلہ وار ارتقائی سفر طے کرتی رہی اسی طرح نوحہ بھی مرحلہ وار اپنی تاریخ امکان کی پیش روی کے امکانی صورت میں اپنا سفر طے کرتا رہا۔اور یہ سلسلہ محض اردو زبان تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ عربی زبان میں بھی نوحہ اسی طرح غیر افہامی صورت میں اپنا سفر طے کرتا رہا۔لیکن فارسی زبان میں اردو زبان ہی کی طرح نوحہ غیر مجہول تحقیقی رویہ کا شکار رہا ہے، اور جو اشعار فارسی میں کربلا کے عنوان سے کہے گئے رثائی اشعار بغیر کسی تحقیقی امتیاز کے مرثیہ کے ضمن میں ہی رکھا گیا۔

فارسی ادب کی تاریخ بہت قدیم ہے ،جس کا تفصیلی ذکر موضوع کی نزاکت کے منافی ہے ۔لیکن فارسی ادب میں نوحہ کے ارتقا کا اہم دور مامون رشید کے عہد کے اس زمانے کو تصور کیا جاتا ہے جب مامون رشید نے خراسان کی زمام حکومت 205 ہجری میں ایران کی ''طاہریہ'' خاندان کے سپرد کی یہ وہ دور تھا جب فارسی زبان وادب کا ارتقائی دور تصور کیا جاتا ہے ،اسی عہد میں باضابطہ خانوادہ رعصمت و طہارت کی مدح و ستائش کو فارسی شاعری کا ایک اہم حصہ تصور کیا جانے لگا۔لہذا ایسے حالات میں کربلا کے واقعات کے اظہار میں شاعروں نے بڑے فراخ دلی کا مظاہر کیا ،اور یہیں سے نوحہ گوئی اور نوحہ خوانی کو عمومی حیثیت حاصل ہوئی اور فارسی کے بیشتر شعرانے اس صنف میں طبع آزمائی کی یہاں تک مولانا روم کی مشہور زمانہ مثنوی کا دیوان ''شمس تبریز'' میں کچھ اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جسے نوحہ کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے۔وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کجائید ای شہیدان خدائی
بلا جویان دشت کربلائی
کجائید ای سبک روحان عاشق
پرندہ تر زمرغان ہوائی
کجائید ای شہان آسمانی
بدانستہ فلک را در کشائی
کجائید ای در زندان شکستہ
بدادہ و مداران رہائی

فارسی ادب میں مرثیہ کو لے کر محققین میں اختلاف رائے مولانا شبلی نعمانی نے ''شعر العجم'' میں سب سے پہلا مرثیہ گو ملا محتشم کاشانی کو بتایا ہے۔لیکن پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق فارسی کا سب سے پہلا مرثیہ گو شاعر ''آذری'' ہے۔لیکن میں ان محققین کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتا،اس لئے کہ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ''آذری'' کی انتقال کی تاریخ 886 ھجری لکھی ہے جو سن عیسوی کے اعتبار سے 1461 ہوتی ہے،اور ملا محتشم کاشانی کی کا دور 1527 عیسوی ہے، لیکن مولانا روم کا عہد (30 September 1207 December 1273 17) ہے۔لہذا اس اعتبار سے سب سے پہلے کربلا کے واقعات سے متعلق جو اشعار کہے ہیں وہ مولانا روم ہیں۔لیکن مولانا روم اور آذری کے مقابلے میں کربلا کے واقعات کے حوالے سے نوحہ گوئی میں ملا محتشم کاشانی کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔چونکہ ان کے ہفت بند کو جو شہرت ملی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔لیکن بیشتر محققین نے ملا محتشم کاشانی کے ہفت بند کو مرثیہ ہی لکھا ہے۔ یہ وہی تسامح ہے جو اردو شاعری میں مرثیہ گوئی کی تاریخ کی دریافت میں واقع ہوا تھا۔جس کی وجہ سے نوحہ کی تاریخ سے محققین نے پس اندازی کا رویہ اختیار کیا۔ملا محتشم کاشانی کے اشعار کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو اس کے ہر شعر میں نوحیت بھر پور پائی جاتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ نوحہ عربی زبان کے علاوہ اردو پشتو، ہندی، گجراتی، مراٹھی، کشمیری، پنجابی، تلگو، تامل، بنگالی، بھوجپوری اودھی، ملیالی اور ہندوستان کی دیگر مشرقی زبانوں کے علاوہ فارسی میں بھی کثرت سے کہے گئے ہیں۔اس کے ساتھ مغربی زبانوں میں بھی انگریزی ،فرانسیسی اور جاپانی زبان میں بھی نوحے پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں نوحہ کا تعلق عمومی طور پر نسائی جذباتی کی عکاسی کرنے کو کہتے ہیں۔رثائی ادب میں نوحہ میں آہ و بکا کے ساتھ اپنے اندرون کرب کا اظہار کرنا بہت ہی اہم ہوتا ہے، بغیر رثائی کیفیت کے نوحہ،نوحہ نہیں کہلا سکتا۔ یہ رثائی صنف سخن کسی ایک مسلک سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس صنف سخن کے اندام سرنوشت میں گنگا جمنی تہذیب اور مختلف تہذیب و ثقافت کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

❑❑❑

میر ببر علی انیسؔ

مرثیہ

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہراؑ کی گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب
ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پرآب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدتِ ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گذر جاتے ہیں

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے
شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سو فواروں سے
لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے
فکر ہے سجدۂ معبود ہیں سر دینے کی
دار سے تیغوں کے فرصت نہیں، دم لینے کی

خوں سے تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے
ہے جبیں چاند سی پر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے
تیرِ بیداد سے دل زخمی، جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آ کر کوئی پہلو میں لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخمِ بدن، زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں، سرِ پاک جھکا جاتا ہے
گردِ زہراؑ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دوجہاں گرتے ہیں

زیں سے ہوتا ہے جدا دوشِ محمد کا مکیں
چمن فاطمہ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہیں سرورِ دیں
ہے یہ نزدیک گرے مہرِ نبوت کا نگیں
پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علیؑ کہتی ہے زینبؑ تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ تلواریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجرِ فولاد ہیں اور اک سر ہے
نہ کوئی یار، نہ ہمدم، نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے، اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں، جا سکتے ہیں

کوئی سید کا نہیں آہ، بچانے والا
حربے لاکھوں ہیں، اور اک زخم اٹھانے والا
پیاس میں کوئی نہیں، پانی پلانے والا
سنبھلے کس طرح بھلا، برچھیاں کھانے والا
چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے، لُو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں، ہے وقت زوال
اینٹھی جاتی ہے زباں پیاس کی شدت ہے کمال
کبھی زینبؑ کا ہے غم گاہ سکینہؑ کا خیال
دن جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال
مثلِ خورشید، بدن ضعف سے تھراتا ہے
نیر برجِ امامت پہ زوال آتا ہے

کان میں آتی تھی زینبؑ کے صدائے جاں کاہ
دل تڑپ جاتا تھا کرتے تھے عجب درد سے آہ
راہ روکے ہوئے خیمے کی، کھڑے تھے گمراہ
نیم وا چشم سے کرتے تھے سوئے خیمہ نگاہ
تنِ زخمی پہ جو پیکانِ ستم گڑتے تھے
خاک سے اٹھتے تھے اور کانپ کے گر پڑتے تھے

کہتا تھا فوج میں سب سے عمر بد اختر
کھنچے کیوں تیغوں کو ہاتھوں میں کھڑے ہو شششدر
ریگِ تفتیدہ پہ ہے غش میں، علیؑ کا دلبر
جاؤ کیا دیر ہے، کاٹو شۂ مظلوم کا سر
تیغ سے فاطمہؑ زہرا کا گلا چاک کرو
جلد ہاں خاتمۂ پنجتن پاک کرو

کانپ کر کہتے تھے سب ہم سے نہ ہوگا یہ ستم
ذبح فرزندِ محمدؐ کو نہیں کرنے کے ہم
ایسے مظلوم کی چھاتی پہ جو رکھے گا قدم
پاؤں جل جائے گا تھرائے گا عرشِ اعظم
پیٹتے قبر سے محبوب خدا آویں گے
بخدا فاطمہ کی آہ سے جل جاویں گے

کون بے کس کو بھلا ذبح کرے بے تقصیر
پھرتا ہے کوئی پیاسے کے گلے پر شمشیر؟
گو کہ بے کس ہے پہ آساں نہیں، قتلِ شبیرؑ
حشر میں ہوئیں گے محبوبِ خدا دامن گیر
تو سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی خوں خواہ نہیں
بنتِ احمدؐ نہیں، حیدر نہیں، اللہ نہیں

تھا جو دمساز عمر ابن نمیر اظلم
بڑھ کے تیغ اس نے سرِ شاہ پہ ماری اس دم
تا جبیں ہو گیا مجروح سرِ شاہِ امم
تھام کر سر کو پکارے یہ امامِ عالم
نہ میسر تجھے اس ہاتھ سے کھانا ہووے
تو تہی دست جہنم کو روانہ ہووے

چاہا ظالم نے کہ پھر شہؑ پہ کرے تیغ کا وار
دیکھا انگشت بدنداں ہیں رسولؐ مختار
خشک اس وقت ہوئے دستِ ستمگر اک بار
ہاتھ سے تیغ گری خوف سے بھاگا، خوں خوار
یاں سرِ پاک سے حضرت کے لہو جاری تھا
خم سوئے قبلہ تھے، بند آنکھیں تھیں غش طاری تھا

جب تڑپنے کی بھی طاقت نہ رہی سرور کو
غل ہوا یہ کہ غش آیا، خلفِ حیدر کو
فوج سے شمر بڑھا کھینچے ہوئے خنجر کو
سب سے کہتا تھا کہ اب کاٹو سرِ سرور کو
خلفِ احمدِ مختار کا قاتل ہوں میں
کام میرا ہے، اسی کام کے قابل ہوں میں

تیز کرتا ہوا خنجر کو گیا شہ کے قریں
آسماں ہل گیا تھرا گئی مقتل کی زمیں
رو رو چلانے لگی زینبؑ ناشادِ حزیں
غش میں بھی گھیرے ہیں، ہے ہے مرے بھائی کو لعیں
رحم زہراؑ کے پسر پر نہیں کھاتا کوئی
خاک سے بھی نہیں زخمی کو اٹھاتا کوئی

گرد زینب کے تھا ناموس پیمبر کا ہجوم
بانو روتی تھی، کھڑی پیٹتی تھی سر، کلثوم
کہتی تھی دیکھ کے میداں کو سکینہ معصوم
اے پھوپھی! نرغۂ اعدا میں ہیں شاہِ مظلوم
جاؤنگی اب میں ٹھہرنے کی نہیں آپ کے پاس
شمر خنجر لیے جاتا ہے، مرے باپ کے پاس

باپ کے پاس سے، جا کر اسے سرکاؤں گی
جوڑ کر ہاتھوں کو منت سے میں سمجھاؤں گی
اپنے بابا کی میں چھاتی سے لپٹ جاؤں گی
خیمے تک ان کو سنبھالے ہوئے لے آؤں گی
بھوکے پیاسے، مرے بابا کو نہ مارے کوئی
ان کے بدلے، مرا سر تن سے اتارے کوئی

کتنا کہتی رہی وہ بنتِ شہؑ عرشِ جناب
اس ستمگر نے دیا کچھ نہ سکینہؑ کو جواب
پیٹ کر سر کہا زینبؑ نے کہ او خانہ خراب
تجھ کو آتا نہیں کچھ روحِ پیمبر سے حجاب
ظلم مت کر اسد اللہ کی جائی ہوں میں
ننگے سر پردے سے باہر نکل آئی ہوں میں

میری اماں کا ہے مشہور جہاں میں پردا
بعدِ رحلت بھی جنازہ نہ کسی نے دیکھا
اس کی بیٹی ہوں، ترے ظلم سے، یہ وقت پڑا
سر برہنہ ہوں، گریباں بھی ہے کرتے کا پھٹا
منہ کو اللہ و پیمبر سے چھپاتا ہے تو
میں تو فریادی ہوں، اور آنکھ چراتا ہے تو

قتل مظلوم کو کیوں کرتا ہے، بے جرم و گناہ
اب تلک میں نے بہت صبر کیا ہے واللہ
دل جلی ہوں میں ابھی سینے سے کھینچوں گر آہ
تو بھی جل جائے، تری فوج بھی ہو خاک سیاہ
بد دعا دوں میں تو نازل ابھی آفت ہووے
سر کے بالوں کو جو کھولوں تو قیامت ہووے

غش میں حضرت نے سنے جبکہ یہ زینبؑ کے سخن
کھول کر دیدۂ پرخوں کو اٹھائی گردن
دیکھا سر ننگے کھڑی روتی ہیں مقتل میں بہن
بنتِ زہراؑ کو پکارے یہ شہنشاہِ زمن
کیا کیا تم نے کہ پردے سے کھلے سر نکلیں
جیتے جی میرے سر پردے سے باہر نکلیں

کس کو سمجھاتی ہو، کوئی نہ سنے گا فریاد
باز آئے گا نہیں، قتل سے میرے جلاد
جتنا تم پیٹتی ہو، اور لعیں ہوتے ہیں شاد
حشر کے روز خدا دیوے گا اس خون کی داد
شوق مرنے کا ہے، سر تن سے جدا ہونے دو
جاؤ گھر میں، مجھے امت پہ فدا ہونے دو

گود میں میری سکینہؑ کو اٹھاؤ ہمشیر
کوئی اصغر کی طرح مار نہ بیٹھے اسے تیر
پھر یہ بیٹی کو پکارے ترے صدقے شبیرؑ
تو بھی جا ساتھ پھوپھی جان کے اب اے دلگیر
وقتِ طاعت ہے ذرا یادِ خدا کر لیویں
ہم بھی اب آتے ہیں، سجدے کو ادا کر لیویں

کہہ کے یہ غش ہوئے پھر رن میں شہنشاہ امم
شمرِ اظلم نے رکھا، سینۂ اقدس پہ قدم
جگرِ فاطمہؑ زہرا پہ چلی تیغِ دو دم
آگے زینبؑ کے ہوئے ذبح حسینؑ آہ ستم
پیٹ کر بنت شہنشاہِ زمن رونے لگی
باپ کو بیٹی، برادر کو بہن رونے لگی

فتح کا فوج مخالف میں بجا نقارا
غل ہوا قتل ہوا شیر خدا کا پیارا
بس انیسؔ اب نہیں گویائی کا مجھ کو یارا
غم سے خوں ہو گیا سینہ میں کلیجا سارا
کس سے اس درد و مصیبت کا بیاں ہوتا ہے
آنکھیں روتی ہیں قلم روتا ہے دل روتا ہے

مرزا سلامت علی دبیرؔ

مرثیہ

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے دربند
جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند
سیارے ہیں غلطاں صفت طائر پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

بے ہوش ہے بجلی پہ سمند ان کا ہے ہشیار
خوابیدہ ہیں سب طالع عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید علم ان کا نمودار
بے نور ہے منہ چاند کا رخ ان کا ضیا بار
سب جزو ہیں کل رتبہ میں کہلاتے ہیں عباس
کونین پیادہ ہیں سوار آتے ہیں عباس

النشر کا ہنگامہ ہے اس وقت سفر میں
الصور کا آوازہ ہے اب جن و بشر میں
البجر کا ہے تذکرہ باہم تن و سر میں
الوصل کا غل ہے سقر و اہل سقر میں
الحشر جو مردے نہ پکاریں تو غضب ہے
الموت زبان ملک الموت پہ اب ہے

روکش ہے اس اک تن کا نہ بہمن نہ تہمتن
سہراب و نریمان و پشن بے سرو بے تن
قاروں کی طرح تحت زمیں غرق ہے قارن
ہر عاشق دنیا کو ہے دنیا چہہ بے زن
سب بھول گئے اپنا حسب اور نسب آج
آتا ہے جگر گوشۂ قتال عرب آج

میداں میں علمدار کے جانے کے میں صدقے
اس فاقے میں تلوار لگانے کے میں صدقے
باہم علم و مشک اٹھانے کے میں صدقے
اس پیاس میں اک بوند نہ پانے کے میں صدقے
سقا بنا پیاسوں کا مروت کے تصدق
بے سر کیا شہ زوروں کو قوت کے تصدق

گر کر لب زخمی سے علمدار پکارا
کہہ دو کوئی پیاسوں سے کہ سقا گیا مارا
سن لی یہ صدا شاہ شہیداں نے قضارا
زینبؑ سے کہا لو نہ رہا کوئی ہمارا
اصغرؑ کا گلا چھد گیا اکبرؑ کا جگر بھی
بازو بھی مرے ٹوٹ گئے اور کمر بھی

گویا کہ اسی وقت جلے خیمے ہمارے
ظالم نے طمانچے بھی مری بیٹی کو مارے
رسی میں مرے خوردوکلاں بندھ گئے سارے
عباسؑ کے غم میں ہوئے ہم گور کنارے
اعدا میں ہے غل مالک شمشیر کو مارا
یہ کیوں نہیں کہتے ہیں کہ شبیر کو مارا

یاں تھی یہ قیامت وہاں خیمہ میں یہ محشر
در پر تھیں نبی زادیاں سب کھولے ہوئے سر
تشویش تھی کیوں لاش کو لے آئے نہ سرور
عباسؑ کا فرزند سراسیمہ تھا باہر
تن رعشے میں خورشید درخشاں کی طرح تھا
دل ٹکڑے یتیموں کے گریباں کی طرح تھا

ضد کرتا تھا ماں سے مرے بابا کو بلا دو
میں نہر پہ جاتا ہوں مرا نیچہ لادو
ماں کہتی تھی بابا کو سکینہؑ کے دعا دو
بابا بھی چچا کو کہو بابا کو بھلا دو
حیدرؑ سے نویں سال چھڑایا تھا قضا نے
واری ترے بابا کو بھی پالا تھا چچا نے

دریا پہ ابھی گھر گئے تھے باپ تمہارے
پیارے کے چچا جاں انہیں لینے کو سدھارے
تو رہ یہیں اے میرے رنڈاپے کے سہارے
بابا کو چچا جان لیے آتے ہیں پیارے
تھا عشق جو عباسؑ سے اس نیک خلف کو
بڑھ بڑھ کے نظر کرتا تھا دریا کی طرف کو

ناگاہ پھرا پیٹتا منہ کو وہ پریشاں
زینبؑ نے کہا خیر تو ہے میں ترے قرباں
چلایا کہ خادم کی یتیمی کا ہے ساماں
بھیا علی اکبر نے ابھی پھاڑا گریباں
بن باپ کا بچپن میں ہمیں کر گئے بابا
مردے سے لپٹتے ہیں چچا مر گئے بابا

یہ غل تھا جو مولا لیے مشک و علم آلے
باقی کوئی دستور عزا رہنے نہ پائے
میں نے تمہیں بیوہ کیا رنڈ سالہ پہنایا

خیمہ میں کمر پکڑے امام امم آئے
اب خیمہ میں اپنے ہر اک اس خیمہ سے جائے
ہے ہے مری اک پیاس نے سب گھر کو رلایا

اور گرد علم بال بکھیرے حرم آئے
اک ایک یہاں پُرسے کو عباسؑ کے آئے
کوثر پہ سدھارا اسد اللہ کا جایا

زینبؑ سے کہا شہ نے بہن لٹ کے ہم آئے
سر ننگے لب فرش سے زینبؑ اسے لائے
اور کنبے کا الزام مرے حصے میں آیا

بھائی کے یتیموں کی پرستار ہو زینب
یہ جعفر و حمزہ کا یہ حیدرؑ کا ہے ماتم
انصاف کرو لوگوں یہ کیا کر گئے عمو

تم مہتمم سوگ علمدار ہو زینب
شبیر کا اکبرؑ کا اور اصغر کا ہے ماتم
میں پیاسی کی پیاسی رہی اور مر گئے عمو

ہاں سوگ کا حیدرؑ کے سیہ فرش بچھاؤ
سب خیموں میں اپنے گئیں کرتی ہوئی زاری
ناگاہ فغاں زیر علم یہ ہوئی پیدا

ہیں رخت عزا جس میں وہ صندوق منگاؤ
یاں کرنے لگی بین ید اللہ کی پیاری
سیدانیو دو مادر عباسؑ کو پرسا

دو سب کو سیہ جوڑے عزادار بناؤ
فضہ نے کہا زینب مضطر سے میں واری
تعظیم کو سب اٹھے کہ ہے نالۂ زہراؑ

شبر کی عزا کا ہمیں ملبوس پہناؤ
اے بنت علیؑ آتی ہے بانو کی سواری
زینبؑ نے کہا اماں وطن میں ہے وہ دکھیا

تم پہنو وہ کالی کفنی آل عبا میں
منہ زیر علم ڈھانپے علمدار کی بی بی
آئی یہ ندا پاس ہوں میں دور کہاں ہوں

جو فاطمہؑ نے پہنی تھی نانا کی عزا میں
پُرسے کے لیے آتی ہے سردار کی بی بی
عباسؑ مرا بیٹا میں عباسؑ کی ماں ہوں

عباسؑ کا یہ سوگ نہیں سوگ ہے میرا
بانو نے قدم پیچھے رکھا فرش سیہ پر
رنڈ سالہ بہو کو میں پہنانے کو ہوں آئی

عباسؑ کا ماتم ہو مرے گھر میں جو برپا
پہلے وہاں بٹھلا دیا اصغر کو کھلے سر
اک حُلۂ پر نور ہوں فردوس سے لائی

نوحے میں نہ عباسؑ کہے نہ کہے سقا
پھر سوئے علم پیٹتی دوڑی وہ یہ کہہ کر
عباسؑ کے ماتم کی تو صف تم نے بچھائی

جو بین کرے رو کے کہے ہائے حسینؑا
قربان وفا پر تری اے بازوئے سرور
سامان سوئم ہوگا نہ کچھ اے مری جائی

سب لونڈیاں یوں روئیں کہ آقا گیا مارا
سنتی ہوں تہہ تیغ ستم ہو گئے بازو
تم روز سوئم ہائے رواں شام کو ہوگی

چلائے سکینہؑ بھی کہ بابا گیا مارا
دریا پہ بہشتی کے قلم ہو گئے بازو
چہلم کو کفن لاش علمدار کو دوگی

زینب نے کہا ہیں میری قسمت کے یہی کام
عباسؑ کو تو میں نہ سمجھتی تھی برادر
لو حیدریو وارد مجلس ہوئیں زہراؑ

دینے لگی ماتم کے یہ جوڑے تو وہ ناکام
میں ان کو پسر کہتی تھی اور وہ مجھے مادر
دو فاطمہؑ کی روح کو عباسؑ کا پرسا

فضہ سے کہا سوگ کا کرتی ہوں سر انجام
اس شیر کے مرجانے سے بیکس ہوئے سرور
اب تک نہیں کفنائے گئے ہیں شہ والا

ٹھنڈا ہوا ہے ہے علم لشکر اسلام
بے جان ہوا حافظ جان علی اکبر
بے گور ہے سردار و علمدار کا لاشا

زہراؑ کا لباس اپنے لیے چھانٹ رہی ہوں
سب کہتے ہیں حضرت کا برادر گیا مارا
رونے نہیں دیتے ہیں عدو آل نبی کو

عباسؑ کا ملبوس عزا بانٹ رہی ہوں
پوچھو جو مرے دل سے تو اکبرؑ گیا مارا
تم سب کے عوض روؤ حسینؑ ابن علی کو

پھر زیر علم فرش سیہ لا کے بچھایا
اتنے میں سنی بالی سکینہؑ کی دہائی
خاموش دبیرؔ اب کہ نہیں نظم کا یارا

اور بیوۂ عباسؑ کو خود لا کے بٹھایا
زینب نے کہا روح علمدار کی آئی
مداح کا دل خنجر غم سے ہے دو پارا

تھے جتنے سیہ پوش انہیں رو کے سنایا
جوڑے ہوئے ہاتھوں کو وہ شبیر کی جائی
کافی پئے بخشش یہ وسیلہ ہے ہمارا

قسمت نے جواں بھائی کا بھی داغ دکھایا
کہتی تھی سزا پانی کے منگوانے کی پائی
اک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا

ناسور نہ کس طرح سے ہو دل میں جگر میں
تعذیر دو یا دختر شبیر کو بخشو
تجھ پر کرم خاص ہے یہ حق کے ولی کا

ماتم ہے علمدار کا سردار کے گھر میں
کس طرح کہوں میں مری تقصیر کو بخشو
یہ فیض ہے سب مدح جگر بند علی کا

میر تقی میرؔ

مرثیہ

حیدرؑ کا جگر پارہ وہ فاطمہؑ کا پیارا
نکلا تھا مدینہ سے ناموس لئے سارا
اس چرخ سیہ روز نے اک فتنے کو سنکارا
اس ظلم رسیدہ کو کن سختیوں سے مارا
کرتا تھا وہ آنکھوں سے خون جگر افشانی
دریا کے کنارے پر پایا نہ تنک پانی

خیموں کو جلاتے تھے آشوب اٹھاتے تھے
شمشیریں علم کرتے بے وسوسہ آتے تھے
لے جاتے تھے واں سے جو تنکے بھی پاتے تھے
جاروب کر اس گھر کو سب خاک اڑاتے تھے
احمدؐ کا نہ پاس ان کو حیدرؑ کا نہ اندیشہ
تھا جور و ستم شیوہ بیدادگری پیشہ

فرصت نہیں ہے اتنی جو دم بھی لیا جاوے
تاکید میں چلنے کی کیا فکر کیا جاوے
کیونکر کے نہ عابدؑ پھر پانی سا ہوا جاوے
پیاسا ہو قبیلہ سب یوں جس کا لٹا جاوے
کیا کیا نہ پدر مردہ بے طاقتی کرتا ہے
ہر آن میں گرتا ہے ہر گام پہ مرتا ہے

ناموس کے بے جا گہ اس آن اترنے کا
ہمراہیوں کے جی سے ناچار گذرنے کا
گھر بار کے جلنے کا فرزندوں کے مرنے کا
انصاف ستم ہرگز یاروں کے نہ کرنے کا
سو دادگری کی واں سب رسم اٹھا دی تھی
آزار رسانی کی تاکید و منادی تھی

اس راہ کے چلنے کی کیا اچھی علامت تھی
آنے کی مدینہ سے ہر اک کو ندامت تھی
ہر حرف تھا اک طعنہ ہر بات ملامت تھی
فریاد سکینہؑ سے ہر گام قیامت تھی
جب رونے وہ لگتی تھی کلثومؑ موئی جاتی
زینب سے گلے لگ کر کچھ غش ہی ہوئی جاتی

انواع ستم ہیں گے بے تاب و تواں اوپر
اقسام جفا ہیں گے دل خستہ جواں اوپر
کچھ طعن نہیں تنہا ہر اک کی زباں اوپر
سر باپ کا بھی آگے جاتا تھا سناں اوپر
اس سخت مصیبت پر کس دل کو شکیب آوے
پتھر کا جگر ہو تو یاں آب ہو بہہ جاوے

اس ہمسر بے وارث اندوہ کی ماری کا
اس دختر بے مشفق نادان بچاری کا
اس جمع پریشاں کی اوقات گذاری کا
اس خانہ خرابی کا بیٹے کی نزاری کا
مرنے کو نہ تھا جی پر ناچار موا آخر
سر جس لئے دھنتا تھا پھر سو ہی ہوا آخر

کوئی نہ رہا جس کو ہو کچھ غم دلداری
غیروں سے دل آزاری اپنوں سے یہ کچھ خواری
عابد کی وہ بیماری وہ بیکس و بے یاری
ہوشہ کے اٹھانے کی کس طرح سے تیاری
اسباب نہیں مطلق وارث نہیں ہے کوئی
یاں بات نہیں سنتے یک سو رہی دلجوئی

اس پیکر مردہ سے کر دل کے تئیں خالی
ناچار گئی آگے بے وارث و بے والی
پھر حد سے ہوئی افزوں بیچارگی بدحالی
تو نے بھی قلم اپنے یاں ہاتھ سے گر ڈالی
تو میرؔ کیا اچھا لکھنے کا نہ تھا شایاں
نہ نوشتہ ہی بہتر ہے ایسا غم بے پایاں

بہادر شاہ ظفرؔ

اسے مجریٰ جو شاہِ دو جہاں ہے
جھکا مجرے کو جس کے آسماں ہے
وہ سرورؐ ہیں شاہِ شہیداں دو جگ کا اجیارا
اللہ کا محبوب ہے وہ اور ہے وہ نبی کا پیارا
علیؑ کا ہے جگر زہراؑ کی جاں ہے

گر اکبرؑ تو برچھی رن میں کھا کر
موا عباسؑ بھی دریا پہ جا کر
مارے گئے سب ساتھی سنگاتی اکبر آپ نراسے
خیمہ جلا گھر بار لٹا اور اہل حرم سب پیاسے
جدھر دیکھو اُدھر شورِ فغاں ہے

جسے زہراؑ نے گودی میں کھلایا
نبیؐ نے دوش پر جس کو چڑھایا
چاروں اور سے اس کے لاگے برچھی بھالے تیر
ماٹی اوپر لوٹے رن میں گھائل سارا شریر
لہو کے زخم سے دریا رواں ہے

ستم ہے ساقیٔ کوثر کا جانی
نہ پائے تین دن اک بوند پانی
پانی کی اک بوند نہیں اور سوکھی جائے زباں
مارے پیاس کی گرمی کے ہونٹوں آئی جاں
لبوں پر پھیرتا سوکھی زباں ہے

گئے اصغرؑ کو شہ گودی میں لے کر
کہ پانی سے کروں اس کا گلو تر
پیاسے گلے میں اس کے اتری ہے تیر کی بوند
دیکھ کے اس نے باپ کی صورت آنکھیں لی موند
گلوئے خشک چشمِ خوں چکاں ہے

ہوا زین العباء محبوس افسوس
پیادہ پا چلا افسوس افسوس
جس کے پاؤں کی ماٹی ہو چاند سورج پر فوق
اسکے ہاتھوں ہتھکڑیاں ہوں اور گلے میں طوق
سفر در پیش ہے اور ناتواں ہے

موا دن بیاہ کے قاسم جو رن میں
جدائی ہو گئی دولہا دلہن میں
کیسی مہندی عطر سہاگ اور کیسی رنگیلی رات
دولہا کے تو ہاتھ کٹین اور دلہن ملتی ہات
غم قاسمؑ ہے یہ شادی کہاں ہے

لہو میں دیکھ کر بھائی کو غلطاں
کہا زینبؑ نے یہ با چشمِ گریاں
ہے ہے جو پیار سے اپنے زہراؑ گودی پالے
اس کے تن پر گھاؤ لاگے بہتے لہو کے نالے
سراب اس کا ہے اور نوکِ سناں ہے

ظفرؔ اس غم سے اک عالم ہے مغموم
زمیں سے تا فلک ماتم کی ہے دھوم
نیلا تاگا آکاش نے کینو جانی اندھیری رین
تارے ناہیں آنسوؤں سے ہے بھرے زمانہ نین
جسے دیکھو غرض ماتم کناں ہے

جمیل مظہری

مرثیہ

شاعری بحر معانی کا تلاطم ہے جمیل
جس میں غلطاں ہیں ستارے یہ وہ قلزم ہے جمیل
رنگ و بو کے جو کنایوں میں خرد گم ہے جمیل
شاعری اس پہ حقیقت کا تبسم ہے جمیل
اہل دانش ہے وہی اہل بصائر ہے وہی
اس تبسم کو جو پہچان لے شاعر ہے وہی

میرے وجدانِ تفکر کو اچھال اے ساقی
لا مرے دل کی صراحی میں ابال اے ساقی
دے مرے صید نظر کو پر و بال اے ساقی
دامِ الفاظ و معانی سے نکال اے ساقی
بھیج دے مجھ کو مری حدِّ نظر سے آگے
اس تبسم کدۂ برق و شرر سے آگے

اے خرد وقت کی آشفتہ بیانی سُن لے
کیوں گلابی ہوا اس نہر کا پانی سُن لے
کارزارِ حق و باطل کی کہانی سُن لے
خوں سے تر ریگِ بیاباں کی زبانی سُن لے
پہنچے اس دشت میں اللہ کے دیوانے چند
پہنچے اور دے دئے تاریخ کو افسانے چند

شوق بھی حیرنی شمس و قمر ہے اے دوست
ابھی پردے کے اسی پار نظر ہے اے دوست
کتنا مشکل یہ بصیرت کا سفر ہے اے دوست
جس میں ہر گام پہ منزل کا خطر ہے اے دوست
اس میں منزل کا گماں راہزنی کرتا ہے
رہبری جذبۂ حب الوطنی کرتا ہے

اس سفر سے جو پھروں دیدۂ بینا لے کر
نکہتِ گیسوئے الہام کا سودا لے کر
شہپرِ بلبلِ شیراز کا خامہ لے کر
سینۂ وحی سے سوزِ دل عیسیٰ لے کر
شمعیں روشن کروں ماضی کے شبستانوں میں
دوں اذاں جا کے تخیل کے صنم خانوں میں

امتحاں عشق کا تھا عشق کے بندے نکلے
ان کی تیغوں سے لپکتے ہوئے شعلے نکلے
ماں کے ہاتھوں سے کفن باندھ کے بچے نکلے
پشتیں سیدھی کئے تنتے ہوئے بوڑھے نکلے
ہنس کے طے مرحلہ تیغ و گلو کرنے لگے
دی جو قرنا نے اذاں خوں سے وضو کرنے لگے

اس کو جانا ہے حجابات تو ہم سے پرے
اس نہاں خانۂ اصوات و تکلم سے پرے
ظلمت و نور کے خاموش تلاطم سے پرے
وطن اس کا ہے دیارِ مہ و انجم سے پرے
جو سر راہ اسے بوئے وطن آتی ہے
آنکھ بے ساختہ تخئیل کی کھل جاتی ہے

آ گیا ذکرِ شہیدانِ محبت ساقی
اس سبو کی ہے نہ ساغر کی ضرورت ساقی
اب نگاہوں میں ہے اک وادیٔ غربت ساقی
دیکھ اک تشنہ دہانوں کی جماعت ساقی
بھول کر خستگی و تشنہ دہانی اپنی
خوں سے لکھی ہے لب نہر کہانی اپنی

چشمِ حیرت سے فلک نے یہ تماشا دیکھا
ٹھاٹیں لیتا ہوا فولاد کا دریا دیکھا
سامنے اس کے بہتر کو صف آرا دیکھا
پھر بھی نیزوں کے نیستاں کو سرکتا دیکھا
مورچے ٹوٹے اجڑتی ہوئی بستی دیکھی
تادمِ عصر گھٹا خوں کی برستی دیکھی

فوجِ شاہی میں ادھر تہنیتِ فتح کی دھوم
اور ادھر خاک پہ امت کے اسیروں کا ہجوم
بے کفن دشت میں ہر فدیۂ ربِّ قیوم
گردِ صحرا کی ردا جن کو اڑھاتی ہے سموم
ہو کا عالم ہے فضا چپ ہے بیاباں چپ ہیں
قافلہ وقت کا چلتا ہے حدی خواں چپ ہیں

کبھی لاشِ شہ والا سے یہ کرتی ہیں کلام
آپ نے سونپ دیا ہے مجھے عباسؑ کا کام
بھیجئے ان کو کہ ہلکی ہو مری پیٹھ امام
آپ خاموش ہیں کیوں لیجئے زینبؑ کا سلام
لائی ہے شدتِ غم اشک فشانی کے لئے
اٹھئے آئی ہے بہن فاتحہ خوانی کے لئے

دوپہر میں ہوا بی بی یہ بھرا گھر خالی
خیمۂ قاسمؑ و عونؑ و علی اکبرؑ خالی
ہوا بے چوبۂ عباسؑ دلاور خالی
آیئے دیکھئے گہوارۂ اصغرؑ خالی
اب نہ بیٹے ہیں نہ پوتے نہ نواسے اماں
لڑے دو لاکھ سے دو روز کے پیاسے اماں

موجیں دریا کی ہیں خاموش ہوا نیند میں ہے
بیکسی چپ ہے گروہِ شہدا نیند میں ہے
ہر اسیر الم رنج و بلا نیند میں ہے
سوئی ہے غیرتِ حق قہرِ خدا نیند میں ہے
کون پہرے پہ ہو بنتِ اسدِ رب کے سوا
کوئی بیدار نہیں ہے دلِ زینبؑ کے سوا

کام سونپا ہے تو اب اٹھ کے دعا دیں حضرت
اور مجھے حوصلۂ صبر و رضا دیں حضرت
جذبۂ معرفتِ امرِ خدا دیں حضرت
جو ہدایت کے طریقے ہیں بتا دیں حضرت
آپ کو اس سرِ بے مقنع و چادر کی قسم
آپ کو آپ کے درسِ تہہ خنجر کی قسم

گرچہ سورج تھا سوا نیزے پہ آیا اماں
امتحاں دیتا رہا آپ کا جایا اماں
رد کیا شہپر جبریل کا سایہ اماں
آپ نے عرش کا پایا نہ ہلایا اماں
اب میں سمجھی، ہے یہ تدبیر شفاعت پیاری
بڑھ کے بیٹے سے بھی تھی باپ کی امت پیاری

آنکھیں اشکوں سے ہیں نم روح حزیں قلب اداس
بال چہرے پہ پریشاں ہیں مگر جمع حواس
ہاتھ میں نیزۂ خطی لئے با حالتِ یاس
کبھی اس لاش کے پاس اور کبھی اس لاش کے پاس
کبھی خیمے میں ہیں عابدؑ کی چٹائی کے قریب
کبھی عباسؑ کے لاشے پہ ترائی کے قریب

وعدہ کرتی ہوں کہ جس راہ میں جاؤنگی میں
اس کے ہر موڑ پہ تاریخ بناؤں گی میں
قوم کو آپ کا پیغام سناؤں گی میں
اسکی سوئی ہوئی غیرت کو جگاؤں گی میں
تربیت یافتہ یا شاہِ زمن آپ کی ہوں
یہ سمجھ لیجئے بھیا کہ بہن آپ کی ہوں

شکوہ کیا لٹ جو گیا خیمۂ عصمت اماں
تھی وہ میراثِ نبیؐ لے گئی امت اماں
شکر اس کا جو ملا اجرِ ہدایت اماں
دیکھئے دست و گلو کی مرے زینت اماں
کیوں نہ یہ طوق یہ کنگن مجھے پیارا ہوگا
آپ نے یوں نہ کبھی مجھ کو سنوارا ہوگا

کبھی کہتی ہے کہ حضرت گئے مارے عباسؑ
تم کو نیند آ گئی دریا کے کنارے عباسؑ
جو فرائض متعلق تھے تمہارے عباسؑ
انکا بوجھ اب مرے کاندھے پہ ہے پیارے عباسؑ
بارِ غم اس کے علاوہ ہے دبی جاتی ہوں
دو سہارا مجھے اٹھ کر کہ جھکی جاتی ہوں

کہہ کے یہ چپ جو ہوئیں خواہرِ شاہِ دوسرا
سسکیاں لینے لگا رات کا وہ سناٹا
آئی خاتونِ قیامت کے جو رونے کی صدا
رُخ بیاباں کی طرف کر کے یہ زینبؑ نے کہا
آپ اب نیند سے چونکی ہیں دہائی اماں
لُٹ چکا گھر تو سواری ادھر آئی اماں

وقت نے سونپ دیا فرضِ قیادت مجھ کو
ہلنے دیتا نہیں احساسِ امانت مجھ کو
اب تو رونے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو
کیا کہے گی علی اکبرؑ کی محبت مجھ کو
وہ جو سوئی ہے تو سوئے شہدا آئی ہوں
لوریاں دے کے سکینہؑ کو سلا آئی ہوں

فیض احمد فیض

مرثیہ

رات آئی ہے شبیر پہ یلغار بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونس ہے تو اک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیرؑ کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ ادھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آل محمد پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بکا اہل حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخر شب جلتا ہے جیسے

اک گوشہ میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
ان خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و در ماندہ و مجبور و دل افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھئے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہر تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہد اقرار وفا تھی
ہر جنبش لب منکر دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہوئے گویا

الحمد قریب آیا غم عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبح شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مبارک ہو عزیزو

پھر صبح کی لو آئی رُخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خوناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لئے آئینہ رو ہو گیا صحرا
خورشید جو ابھرا تو لہو ہو گیا صحرا

پر باندھے ہوئے حملے کو آئی صف اعدا
تھا سامنے اک بندۂ حق یکہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اک تھا ادھر خون کا پیاسا
یہ رعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خطبہ کیا ارشاد امام شہداء نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسر پیکار ہو لوگو
واللہ کی مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سطوت نہ حکومت نہ حشم چاہئے ہم کو
اورنگ نہ افسر، نہ علم چاہئے ہم کو
زر چاہئے، نے مال و درم چاہئے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہئے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اک حرفِ یقیں، دولت ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصار کے، نیکی کے، مروت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکر دیں ہے

تا حشر زمانہ تمہیں مکار کہے گا
تم عہد شکن ہو، تمہیں غدار کہے گا
جو صاحب دل ہے، ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حر ہے، ہمیں احرار کہے گا
نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کہ ختم سخن محو دعا ہو گئے شبیر
پھر نعرہ زناں محو وغا ہو گئے شبیر
قربان رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیر
خیموں میں تھا کہرام، جدا ہو گئے شبیر
مرکب پہ تن پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنت فردوس کا در تھا

حفیظ جالندھری

مرثیہ

لباس ہے پھٹا ہوا، غبار میں اٹا ہوا
عبا بھی تار تار ہے، تو جسم بھی فگار ہے
تمام جسم نازنیں، چھدا ہوا کٹا ہوا
زمین بھی تپی ہوئی فلک بھی شعلہ بار ہے
یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہ سوار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن، یہ صف شکن فلک فگن
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
کمالِ صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے

یہ کون حق پرست ہے، مئے رضائے مست ہے
دلاوری میں فرد ہے، بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
کہ جس کے دبدبے سے رنگ دشمنوں کا زرد ہے
اُدھر ہزار گھات ہے، مگر عجیب بات ہے
حبیب مصطفیٰ ہے یہ، مجاہدِ خدا ہے یہ
کہ ایک سے ہزار کا بھی حوصلہ شکست ہے
جبھی تو اس کے سامنے، یہ فوج گرد گرد ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے، کمال فن حرب سے
اُدھر سپاہِ شام ہے، ہزار انتظام ہے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں، اِدھر فقط اِمام ہے
غضب ہے تیغِ دوسرا کہ ایک ایک وار پر
مگر عجیب شان ہے غضب کی آن بان ہے
اُٹھی صدائے الاماں زبانِ شرق وغرب سے
کہ جس طرف اُٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے
یہ بالیقیں حُسین ہے، نبی کا نُورِعین ہے

صادق علی نقوی حسینؔ جائسی

مرثیہ

آج مقتل میں عجب بے سروساماں ہیں حرم
دل ہیں مجروح کھلے سر ہیں پریشاں ہیں حرم
قتلِ شبیرؑ سے بیتاب ہیں گریاں ہیں حرم
وارثوں میں نہیں اب کوئی تو حیراں ہیں حرم
ذکر مظلومیٔ شاہِ مدنی کرتے ہیں
کبھی آہیں تو کبھی سینہ زنی کرتے ہیں

کان میں پہنچی جو سجادؑ کے زینبؑ کی صدا
کھول کر آنکھ یہ کی عرض بصد آہ و بکا
کیا کہوں آپ سے قابو میں نہیں دل بخدا
تپ زیادہ ہے تو غفلت بھی ہے کچھ آج سوا
کون مارا گیا اور کون جدا ہوتا ہے
مجھ کو کچھ ہوش نہیں ہے کہ یہ کیا ہوتا ہے

سن کے یہ کہنے لگیں زینبؑ تفتیدہ جگر
لے گئے لوٹ کے اسباب تو سب بانیٔ شر
اسی اسباب میں وہ فرد بھی تھی اے دلبر
سن کے کہنے لگے سجادؑ یہ بادیدۂ تر
فکر کچھ اور میں پابندِ الم کرلوں گا
قتل جو ہوگئے نام ان کے رقم کرلوں گا

خیمے سب جل چکے ہیں لوٹ چکے ہیں اعدا
فرق پر ہے کسی بی بی کے نہ مقنع نہ ردا
شام ہونے کو ہے سنسان ہے جنگل سارا
پاس بچوں کو لئے بیٹھی ہیں بنت زہراؑ
پیار کرتی ہیں اِسے گہہ اسے سمجھاتی ہیں
کوئی معصوم جو روتا ہے تو بہلاتی ہیں

بولے فضہؑ سے یہ پھر عابدِ بیمارؑ و حزیں
جتنے بچے ہیں بلا لو تو انہیں میرے قریں
جمع فضہ نے کیا بچوں کو لالا کے وہیں
پر نہ دو لڑکے تھے اور ایک سکینہؑ غمگیں
ڈھونڈنے چار طرف مثل نظر جاتی تھی
ان کے رونے کی صدا بھی نہ مگر آتی تھی

کہہ کے یہ لکھنے لگے خاک پہ نامِ شہدا
یاد آئے جو وہ سب کرنے لگے آہ و بکا
دل پہ اک تیر لگا نام جو اصغرؑ کا لکھا
غمِ جانکاہ سے تھرا گئے سارے اعضا
یاد کرتے تھے انہیں جب تو جگر جلتا تھا
تین بچوں کا کہیں پر نہ پتہ چلتا تھا

روکے فرماتی ہیں یہ خواہرِ سلطانِ انامؑ
اٹھو سجادؑ کہ اب دن ہوا جاتا ہے تمام
جھٹ پٹا وقت ہے کچھ دیر میں ہونے کو ہے شام
اب نہ قاسمؑ ہیں نہ عباسؑ نہ اکبرؑ نہ امامؑ
دلِ پُر درد پہ اک غم کی گھٹا چھائی ہے
رات ہونے کو ہے اور عالمِ تنہائی ہے

کہا عابدؑ نے کہ اے خواہرِ سلطانِ ہداؑ
لایئے شہؑ نے بنائی ہے جو فردِ شہدا
دیکھ لوں وہ تو مرے دل کو تسلی ہو ذرا
نام تحریر ہے اس فرد میں کس کا کس کا
جو گئے خلد میں اب خواب ہے صورت ان کی
جو مرے ساتھ ہیں لازم ہے حفاظت ان کی

روکے کرنے لگیں سجادؑ سے زینبؑ یہ کلام
جائے تشویش ہے دن کوئی گھڑی میں ہے تمام
ڈھونڈھنے بچوں کو جاتی ہوں کہ ہو جائے نہ شام
دو اجازت مجھے بیٹا کہ تمہیں اب ہو امامؑ
راستہ بھول گئے ہیں نہ ادھر آئیں گے
دشت میں جاکے پکاروں گی تو مل جائیں گے

لے کے رخصت چلیں عابدؑ سے وہ بنتِ زہراؑ
عرض کی اس نے جگر تھام کے بادیدۂ تر
یہ تو بہلاتی تھیں رو رو کے وہ دیتی تھی جواب

آ ذرا ساتھ مرے مڑ کے یہ فضہ سے کہا
ابھی صحرا میں جو اک سمت پڑی میری نظر
آتشِ غم سے وہ ننھا سا کلیجہ تھا کباب

وہ بھی ہمراہ ہوئیں کرتی ہوئی آہ و بکا
دیکھا اک لاشۂ پُرخوں ہے زمیں پر بے سر
گود میں مچلی ہوا دل جو زیادہ بیتاب

پاؤں رکھتی تھیں کہیں اور کہیں پڑتا تھا
لڑکی اک چھوٹی سی بیٹھی ہوئی روتی ہے مگر
پیار کر کے اسے زینبؑ نے بچشمِ پُر آب

جابجا دشت میں لاشے جو نظر آتے تھے
وہ بھی روتا ہے ادھر جس کا گذر ہوتا ہے
لی بلائیں کبھی، گہہ آنکھوں سے آنسو پونچھے

دل دھڑکتا تھا قدم خوف سے تھرّاتے تھے
اس کے نالوں سے عجب دل پہ اثر ہوتا ہے
خون سرور سے بھرے جو تھے، وہ گیسو پونچھے

آہ تھی لب پہ رواں اشک تھے اور دل تھا فگار
روکے فرمانے لگیں زینبؑ مجروح جگر
دونوں بچوں کو چلیں ڈھونڈھنے پھر وہ مضطر

اک طرف کو یہ چلی جاتی تھیں با حالتِ زار
مہربانی کا صلہ دے تجھے ربِّ اکبر
ناگہاں جا پڑی اک سمت بیاباں میں نظر

ناگہاں دور سے دکھلائی دیا ایک سوار
بس پتہ مل گیا احساں ہوا تیرا مجھ پر
دیکھتی کیا ہیں کہ وہ باغ نبی کے گل تر

بولیں فضہ سے یہ زینبؑ کہ ذرا بڑھ کے پکار
کہہ کے اس سمت چلیں گریہ کناں خاک بسر
باہیں گردن میں ہیں اور سو رہے ہیں رکھے سر

منتیں اس کی کریں گے تو ترس کھائے گا
اشک خوں بہتے تھے قابو میں دلِ زار نہ تھا
گرد اس طرح ہے ان چاند سے رخساروں پر

اس سے بچوں کا پتہ دشت میں مل جائے گا
ایک فضہؑ کے سوا دوسرا غمخوار نہ تھا
ابر باریک ہو جس طرح سے سیاروں پر

حکم پانا تھا کہ فضہ نے یہ دی بڑھ کے صدا
آئیں نزدیک غرض زینبؑ تفتیدہ جگر
آئیں نزدیک جو روتی تو یہ نقشہ دیکھا

اے سوار اس طرف آ اس طرف آ بہرِ خدا
بیٹھ کر لے لیا آغوش میں بادیدۂ تر
ہونٹ سوکھے ہوئے تھے پیاس جو تھی حد سے سوا

کوئی تکلیف نہ دیں گے تجھے ہم اس کے سوا
بولیں لپٹا کے کلیجے سے میں قرباں تجھ پر
جس جگہ پا کے تری کچھ ہو کلیجہ ٹھنڈا

ہم غریبوں کی ہے اک عرض اسے سنتا جا
تو نے پہچان لیا باپ کا لاشہ کیوں کر
مٹی سرکا کے وہاں لیٹے ہیں وہ ماہ لقا

دل ہے مجروح بہت روئی جو ہے بھائی کو
ہجر سے مادرِ ناشاد موئی جاتی ہے
باپ کا سینہ نہیں ماں کی بھی آغوش نہیں

تجھ سے کچھ پوچھنا ہے فاطمہؑ کی جائی کو
بی بی اب گھر میں چلو رات ہوئی جاتی ہے
ایسے غافل ہیں کہ تن کا بھی انہیں ہوش نہیں

متوجّہ ہوا وہ سنتے ہی فضہؑ کی صدا
عرض کی اس نے پھوپھی سے یہ بصد آہ و بکا
دیکھتے ہی انہیں بس بیٹھ گئیں زینبؑ زار

پاس آ کر کہا کیا پوچھتی ہے اے دکھیا
فرقتِ شہ میں تڑپنے جو لگا دل میرا
لے کے دونوں کی بلائیں کیا پھر خوب سا پیار

بولیں یہ خواہرِ شبیرؑ کہ اے مردِ خدا
آ کے اس دشت میں چلائی میں بابا، بابا
سر رکھے خاک سے زانو پہ اٹھا کر اک بار

کسی بچے کو تو دیکھا نہیں تو نے یہ بتا
اے پھوپھی مجھ کو اسی لاش سے آئی یہ صدا
بولیں اب گھر میں چلو نیند سے ہو کر ہشیار

تشنہ لب ہیں، وطن آوارہ ہیں، دکھ پائے ہیں
آئی ہوں سینۂ شبیرؑ پہ سونے کے لئے
سرد جنگل کی ہوا باعثِ آرام ہوئی

چھوٹ کر ساتھ سے جنگل میں چلے آئے ہیں
کہا زینبؑ نے کہ اب گھر چلو رونے کے لئے
دشت غربت میں خبر بھی ہے تمہیں شام ہوئی

روپ کماری

مرثیہ

زینت حجلۂ عفت ہیں جنابِ زہراؑ
رونقِ کشورِ عصمت ہیں جنابِ زہراؑ
خلق میں حق کی ودیعت ہیں جنابِ زہراؑ
پرتوئے مہرِ نبوت ہیں جنابِ زہراؑ
باپ کی طرح سے یکتائے زمانہ یہ ہوئیں
مختصر یہ ہے کہ دنیا میں یگانہ یہ ہوئیں

مظہرِ نورِ رسالتؐ ہیں جنابِ زہراؑ
گل جو احمدؐ ہیں تو نکہت ہیں جنابِ زہراؑ
والیٔ ملکِ شریعت ہیں جنابِ زہراؑ
منبعِ عفت و عصمت ہیں جنابِ زہراؑ
مصحفِ پاک میں دیکھے کوئی قصہ ان کا
مہر کا خلد میں ہے پانچواں حصہ ان کا

زینتِ محفلِ حورانِ جناں ہیں زہراؑ
دلِ محبوبِ خدا جانِ جہاں ہیں زہراؑ
ساکنِ فرش ہیں پر عرش مکاں ہیں زہراؑ
خلق میں احمدِؐ مرسل کا نشاں ہیں زہراؑ
سہو و نسیاں سے بری مثلِ پدر ہیں بی بی
عین محبوبِ الٰہی کی نظر ہیں بی بی

لکھنے کو بیٹھی ہوں اس صاحبِ عفت کا میں حال
پردۂ دل سے یہ مضموں کا نکلنا ہے محال
مدح زہراؑ کروں پر ہوگی نہیں میری مجال
مجھ سے در پردہ میرا ذہن یہ کرتا ہے مقال
ہے خبر بنتِ پیمبرؐ کی ثنا مشکل ہے
ہو سکے مدحتِ داور بخدا مشکل ہے

آپ کے ہاتھ ہے بھگوان کے سب ملک کا راج
کل کی رانی ہوئیں پایا جو ہے علیا مہراج
اسی بی بی کے سبب رہ گئی اسلام کی لاج
نسخۂ الفتِ زہراؑ ہے گناہوں کا علاج
عاصیوں کے لئے ہیں نوحؑ کی کشتی زہراؑ
کر چکیں اپنے محبوں کو بہشتی زہراؑ

کس کو کونین میں حاصل ہوئی عزت ایسی
کب ملی یوسفِ کنعان کو صورت ایسی
طاہرہ ہو گئیں مشہور طہارت ایسی
فخرِ کونین ہوئی پائی سعادت ایسی
دیکھ کر بیٹی کا منھ شکرِ خدا کرتے تھے
ان کی تعظیم رسولِ دوسراؐ کرتے تھے

آپ ہی حق کی کنیزوں میں ہیں مخصوص کنیز
باحیا عاقلہ با عفت و با ہوش و تمیز
جانِ محبوبِ خدا حضرتِ عمراں کی عزیز
اس شرف پر بھی سمجھتی رہیں خود کو ناچیز
راز اللہ و نبیؐ نے کئے ظاہر ان سے
گیارہ معصوم ہوئے طیب و طاہر ان سے

ان کے بچے ہوئے سردارِ جوانانِ جناں
رونقِ خانۂ دل نورِ نظر راحتِ جاں
انہی بچوں کا تو پرماتما ہے مرتبہ داں
دور ان سے کیا خالق نے خطا و نسیاں
روح نانا کی فدا باپ کی جاں قرباں ہو
تربیت ایسی ہو بچوں کی جب ایسی ماں ہو

ان کی ہمسر ہوئیں مریم نہ جنابِ حوا
آسیہ خود درِ زہراؑ پہ رہیں ناصیہ سا
مرتبہ آپ سے آدھا بھی نہ سارہ کو ملا
ان کی توقیر کجا مادرِ شبیرؑ کجا
ان کی تعظیم شہنشاہِ عرب کرتے تھے
یہ وہ بی بی ہیں ملک جن کا ادب کرتے تھے

زینتِ عرش بریں اور چلن خوش اوقات
باپ کی طرح سے مقبول خدا نیک صفات
وہی احمدؐ کی سی خو بو وہی سارے عادات
ساری خالق کی کنیزوں میں رفیع الدرجات
کس نے زہراؑ کی طرح رتبۂ عالی پایا
کون سی بی بی کو تطہیر کا آیہ آیا

سختیاں جھیلیں زمانہ کی ہراساں نہ ہوئیں
دکھ سہے سکھ سے نہ رہنے دیا گریاں نہ ہوئیں
خدمتی بن گئیں بی بی پہ پریشاں نہ ہوئیں
بے وفائی کی شکایت نہ کی نالاں نہ ہوئیں
رنج تا زیست سہے غم سے ہم آغوش رہیں
دکھ اٹھاتی رہیں پر ساکت و خاموش رہیں

عرشِ اعظم پہ ہوا کون سی بی بی کا بیاہ
کس کا شوہر ہوا دنیا کے لئے پشت پناہ
باعثِ خلقتِ آدم پدرِ عالی جاہ
ان کا ہم رتبہ ہو کوئی عیاذاً باللہ
خلق کے واسطے ہیں مریم کبریٰ زہراؑ
مرتے مرتے بھی پکاروں گی میں زہراؑ زہراؑ

سر سے جب ان کے اٹھا سایۂ محبوبِ خدا
سوگ میں باپ کے تا زیست نہ بدلا کرتا
عمر بھر سر پہ رہی ایک وہی میلی ردا
بس عبادت سے سروکار تھا با آہ و بکا
نہ تکلم نہ تبسم نہ کچھ کہتی تھیں
بی بی ڈھانکے ہوئے منھ گھر میں پڑی رہتی تھیں

باپ کی موت کا ایسا ہوا زہراؑ پہ اثر
مرتے دم تک رہیں نالاں و پریشاں مضطر
گھر میں رونے کے سوا کام نہ تھا آٹھ پہر
شب کو آہیں تھیں گذر جاتا تھا روتے دن بھر
رفتہ رفتہ اسی حالت میں بخار آنے لگا
دن بدن پھول محمدؐ کا یہ کمھلانے لگا

راتیں رونے میں تو دن آہ و بکا میں گذرا
وقتِ شب فرقتِ شاہِ دوسرا میں گذرا
گذرا جو دم وہ اسی رنج و بلا میں گذرا
وقت باقی کا عباداتِ خدا میں گذرا
کبھی رونے میں کبھی آہ و بکا میں کاٹے
آخری زیست کے دن جور و جفا میں کاٹے

دن بدن مرض بڑھا خون گھٹا ضعف ہوا
باتیں کرنے میں الٹنے لگا دم حد سے سوا
رات بے چینی میں دن کرب میں سارا گذرا
آہ لب تک کبھی آئی تو کبھی غش آیا
اشکِ باری سے کسی وقت بھی فرصت نہ ملی
باپ کے بعد زمانہ میں طبیعت نہ لگی

کر دیا ضعف و نقاہت نے تکلم دشوار
چین دل کو کبھی ملتا تھا نہ اور شب کو قرار
غش پہ غش آ گئے کروٹ جو کبھی لی اک بار
آخری موت کے جو ہو گئے ظاہر آثار
جمع بچوں کو کیا پند و نصیحت کے لئے
پاس حیدرؑ کو بھی بلوایا وصیت کے لئے

بولی زینبؑ سے وہ ناموس شہ بدر و حنین
تجھ سے اک آخری خواہش ہے مری نورالعین
پہنچے جس وقت کہ تو کرب و بلا کے مابین
اور پاس آئے ترے آخری رخصت کو حسینؑ
صدقہ جاؤں نہ کہا بھولیو اس دائی کا
چوم لینا مری جانب سے گلا بھائی کا

پھر کہا فخرِ امامت سے کہ اے شاہِ ہدا
وقت آخر ہے مرا آپ سے ہوتی ہوں جدا
معاف کر دیجئے ہو آپ کو مجھ سے جو گلا
گر خطا کوئی ہوئی ہو تو بجل کر دینا
چاہتی ہوں کہ قیامت میں نہ روپوش رہوں
آپ کے حق سے بھی محشر میں سبکدوش رہوں

شہ نے فرمایا رضامند ہے حیدرؑ تم سے
کچھ شکایت نہیں اے بنتِ پیمبرؐ تم سے
آپ میں ہوتا ہوں محجوب سراسر تم سے
ضبط دشوار ہے زہراؑ کہوں کیونکر تم سے
فاقے پر فاقے کئے تم نے علیؑ کے گھر میں
چکیاں پیسی ہیں خالق کے ولی کے گھر میں

کر دیا خوب ادا حقِ رفاقت تم نے
جس قدر چاہئے کی میری اطاعت تم نے
گھر میں حیدرؑ کے نہ پائی کبھی راحت تم نے
کچھ خطا کی نہیں خاتونِ قیامت تم نے
عمر بھر دکھ سہے کیا کیا نہ اٹھائی ایذا
کسی تکلیف کا پر آپ نے شکوہ نہ کیا

فاطمہؑ تم سے نہ محجوب ہو کس طرح علیؑ
جس غریبی سے گذاری وہ نہیں کس پہ جلی
سخت ایذائیں سہیں پر نہ شکایت کبھی کی
خود پشیمان علیؑ تم سے ہے اے بنتِ علیؑ
گھر میں حیدرؑ کے سدا رنج و بلا میں گذری
حد ہے اس وقت تلک ایک ردا میں گذری

فاطمہؑ بولیں نہ اس طرح کی کیجئے گا مقال
آپ پر کب ہے چھپا اے مرے والی مرا حال
خشک و تر آپ سے مخفی ہو یہ ہے امرِ محال
ملتجی ہوں کہ رہے میری وصیت کا خیال
بعد میرے مرے بچوں پہ عنایت رکھنا
یہی الطاف کا شیوہ یہی شفقت رکھنا

یوں تو مظلوموں کا شبیرؑ حزیں ہے سرتاج
پر تمہیں علم ہے جس طرح کا نازک ہے مزاج
صدمہ اسکا ہے کہ زہراؑ سے یہ چھٹ جائیگا آج
بعد میرے نہ کسی شئے کا رہے یہ محتاج
اس کو دکھ ہوگا تو میں قبر میں دکھ پاؤں گی
یہ جو روئے گا تو مرقد سے نکل جاؤں گی

وحید اختر

مرثیہ

ہے قافلۂ جرأتِ رفتار سفر میں
منزل کا نشاں بھی نہیں اس راہ گذر میں
تا حدِّ نظر ریگِ بیاباں ہے نظر میں
سایہ ہے نہ پانی رہِ پُر پیچ خطر میں
گردوں ہے شرربار زمیں آگ کا دریا
پھیلا ہوا ہے دور وقریں آگ کا دریا

ہے لُو کا تھپیڑا کہ طمانچہ ہے اجل کا
وہ زورِ ہوا، کوہ بھی جس کے لئے ہلکا
چلنا بھی غضب قہر ٹھہرنا بھی ہے پل کا
ہر گام یہ ڈر زیست کا پیمانہ ہی چھلکا
ہمت کا سفینہ ہے گھرا موت کی رو میں
چلتی ہے قدم مارتی زیست اس کے جلو میں

کب چھوٹا تھا گھر نکلے تھے روز سفر پر
یا پاؤں میں ہے روزِ ازل سے یہی چکر
کون ان سے یہ پوچھے کہ کہاں ٹھہرینگے جا کر
ہر موج کا سر توڑ کے ابھرے یہ شناور
ان میں کا ہر اک فرد ارادے کا دھنی ہے
گھر ان کا سفر اور وطن بے وطنی ہے

یہ قافلۂ جستجوئے اہلِ نظر ہے
جو روزِ ازل سے یونہی سرگرم سفر ہے
چہرے پہ اٹی گردِ سرِ راہ گذر ہے
آنکھوں میں چمکتی ہوئی امیدِ ظفر ہے
صحرا ہو کہ دریا ہو کہ طوفانِ جفا ہو
رُک سکتا نہیں پائے طلب لاکھ بلا ہو

گر چشمِ تصور میں بصارت ہو تو دیکھو
گر ذہن میں پرواز کی طاقت ہو تو دیکھو
گر فکر میں کونین کی وسعت ہو تو دیکھو
گر روح میں حل روحِ صداقت ہو تو دیکھو
کس شان سے اٹھتے ہیں قدم اہلِ ہمم کے
ہے عزتِ جاوید لگی ساتھ قدم کے

چھائی ہے گھٹا ظلم کی خورشید شرف پر
سنگ اڑتے ہوئے آتے ہیں ایماں کے صدف پر
نرغہ ہے جفاؤں کا پیمبرؐ کے خلف پر
تلواریں برستی ہیں دُرِ شاہِ نجف پر
ہے ایک ہدف اور کماں دار ہزاروں
اک مصحفِ حق اور خطا کار ہزاروں

تیر آتے ہیں سینے پہ کڑکتی ہیں کمانیں
گرز اور تبر ہیں کہ قضا کی ہیں اڑانیں
پہلو میں ہیں پیوست خطا کار سنانیں
پیاسے کا لہو پیتی ہیں نیزوں کی زبانیں
گرنے کو ہیں شہ اور کوئی ہمراہ نہیں ہے
دشمن ہیں سبھی کوئی ہوا خواہ نہیں ہے

وہ مصحفِ حق گرتا ہے جو حق کی اماں ہے
وہ گرتا ہے جو احمدؐ مرسل کی زباں ہے
وہ گرتا ہے جو فاطمہؑ کا پارۂ جاں ہے
وہ گرتا ہے جو فاتحِ خیبر کا نشاں ہے
وہ گرتا ہے قرآن وخدا جس کی طرف ہے
وہ گرتا ہے جو دستِ دعا برجِ شرف ہے

تلواریں تڑپتی ہیں کہ پہلو میں اسے لے لیں
جھکتی ہیں سنانیں کہ دلِ و دیدہ کو چومیں
بے چین ہیں نیزے کہ وہی بڑھ کے اتاریں
منہ چومتی ہیں تیروں کی بے آب زبانیں
ہتھیاروں میں رستہ جو نہیں پاتی ہیں زہراؑ
پھیلائے ہوئے باہوں کو چلاتی ہیں زہراؑ

شمر آتا ہے خنجر بکف و رعشہ بر اندام
ہونے کو ہے وہ ظلم کہ ہو جائے گا کہرام
سرنور کا کٹ جائے گا روئے گی لہو شام
شق ہوگی زمیں غم سے فلک ہوگا سیہ فام
روح قدس اب مرثیہ خوانی کے لئے ہے
سرچشمۂ فیض اشک فشانی کے لئے ہے

اے خیر بشر! اپنے نواسے کو سنبھالو
اے سیدہؑ! فرزند کے چہرے کی بلا لو
اے عقدہ کشا دہر کے پیاسے کو بچا لو
حق والوں یہ ہے حق کا علم بڑھ کے اٹھا لو
حق اور صداقت کا گلا کٹتا ہے لوگو
انساں کی نجابت کا گلا کٹتا ہے لوگو

آئی جو کمی مہر حق آگاہ کی ضو میں
گہنا گئے سورج کئی ظلمات کی رو میں
ایمان کا اگھر جلنے لگا ظلم کی لو میں
پامال ہوئی نعشِ حسینؑ اس تگ و دو میں
خیمے سے وہاں زینبؑ گریاں نکل آئی
گھبرا کے یہاں شامِ غریباں نکل آئی

شوکت تھانوی

مرثیہ

آ اے قلم کہ تجھ کو سعادت عطا کریں
جنبش میں تجھ کو لائیں ترا حق ادا کریں
جس غم میں مبتلا ہیں تجھے مبتلا کریں
تیری زباں سے ذکر شہ کربلا کریں
ذکرِ حسینؑ اصل میں ذکر رسولؐ ہے
یہ وہ مماثلت ہے جو سب کو قبول ہے

معصوم عمر، کھیل کے دن، اور یہ شعور
نادانیوں کے دور میں نادانیوں سے دور
اس کمسنی میں اور یہ قرآن پر عبور
نانا بھی دیکھتے تھے نواسہ پہ اپنا نور
کہتے تھے کسب نور کرو نور عین سے
میرا حسینؑ مجھ سے ہے میں ہوں حسینؑ سے

جب مرتبہ شہید کا اکبرؑ بھی پا گئے
اصغر ہمک کے باپ کی گودی میں آ گئے
کس خاندان سے ہیں یہ سب کو بتا گئے
ہنس ہنس کے ایک تیر قضا وہ بھی کھا گئے
بولے حسینؑ آخری میرے چمن کا پھول
پروردگار نذر ہے تیری جو ہو قبول

منزل شناس جن کی قیادت وہی حسینؑ
وہ سرخرو ہے جن کی شہادت وہی حسینؑ
نازاں تھی جن پہ جن کی امامت وہی حسینؑ
آئینۂ جمال رسالت، وہی حسینؑ
وہ گلستان فاطمہ زہراؑ کا سرخ پھول
خوشبو سے جس کی جھومتے تھے خود بخود رسولؐ

کہتے تھے خود رسول کہ بیٹھا ہو قبلہ رو
مجھ سا مرے حسینؑ کو پاؤگے ہو بہو
عادات میں کہیں سے نہیں فرق مو بمو
دیکھو مرے حسینؑ میں میری ہر ایک خو
میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سر بسر حسینؑ
آئینہ درمیاں ہے ادھر میں ادھر حسینؑ

سب کچھ لٹا کے رن کی طرف اب چلے ہیں شاہ
آراستہ ہے ان کے لئے خود رضا کی راہ
ان کے ثبات عزم کا ہے خود خدا گواہ
پہنچانے جا رہی ہے سکینہؑ کی ایک آہ
خیمہ میں لاڈلی کو بلکتا ہی چھوڑ کے
دنیا سے جا رہے ہیں یہ منھ اپنا موڑ کے

ذی فہم، با شعور، خردمند، بردباد
معصومیت کے ساتھ ابھی سے عجب وقار
عزم بلند اور طبیعت میں انکسار
جرأت کا معرکہ ہو تو شمشیر آبدار
میزانِ حق پہ ظاہر و باطن تلا ہوا
رکھا ہو جیسے سامنے قرآں کھلا ہوا

اسلام کو زوال ہو اور میرے جیتے جی
میں قول دے رہا ہوں کہ ہوگا نہ یہ کبھی
زندہ ہوں میں تو آنچ نہ امت پہ آئے گی
حاضر اس امتحان کو ہوں اماں میں آج بھی
وعدہ رہا کہ سر ہے یہ اسلام کے لئے
تیار ہوں ابھی سے ہر انجام کے لئے

مقتل میں آئے حشر سا آخر بپا کیا
بچپن میں جو کہا تھا وہ وعدہ وفا کیا
حاصل ہے جو سجود کا سجدہ ادا کیا
شمر لعیں نے جسم سے سر کو جدا کیا
خیمہ میں شور اٹھا کہ سکینہؑ بھی کھو گئیں
وہ آ کے اپنے باپ کے لاشے پہ سو گئیں

کیفی اعظمی

نظم

یاد ہے وہ معصیت زا تیرگی چھائی ہوئی
عصمتِ کونین جب پھرتی تھی گھبرائی ہوئی
سانس لیتی تھی ضمیر دہر میں فرعونیت
عظمتِ موسیٰ الگ بیٹھی تھی شرمائی ہوئی
پیکرِ عالم میں روح اہرمن تھی گرم کار
سطوتِ یزدانیت رکھی تھی کفنائی ہوئی

آستینِ آدمیت میں چھپی تھی شیطنت
نور کے دامن میں تاریکی تھی لہرائی ہوئی
پائے شر پر رکھ دیا تھا فرقِ طاعت خیر نے
جہل کی مٹی میں تھی تعلیم دفنائی ہوئی
قلب گیتی میں گرجتا تھا دفینوں کا غرور
زندگی فاقوں کے صدمے سے تھی مرجھائی ہوئی
اتقیا کی بزم میں جلتے تھے نغموں کے چراغ
زہد کے ساغر میں موج مئے تھی بل کھائی ہوئی
شرک نے بت سج دئے تھے پہلوئے توحید میں
زانوئے باطل پہ حق کو نیند تھی آئی ہوئی
مسند اسلام پر قابض تھا الحادِ یزید
دہریت تھی مطلعِ ایماں پہ منڈلائی ہوئی

آہ جو اسلام تھا فطرت کا پہلا شاہکار
تھی اسی اسلام کی جاں ہونٹوں پہ آئی ہوئی

چپ سی سادھی تھی اذانوں نے ننگوں تھیں طاعتیں
تھی خنک سجدوں پہ دل کی تیرگی چھائی ہوئی
روح قرآں بھر رہی تھی سسکیاں الفاظ میں
حمد تھی الجھی ہوئی تہلیل تھرائی ہوئی
تک رہی تھی چشمِ حسرت سے سوئے قبر نبیؐ
شرع، گمراہی کی تاریکی میں کفنائی ہوئی

ٹھوکریں کھاتی تھی امت چھوڑ کر راہِ صواب
پھر رہی تھی راستی شیطاں کی بہکائی ہوئی
زر پرستوں کی جبیں پر ضوفگن تھے تاجِ زر
خواجگی تھی فرش استغنا پہ اٹھلائی ہوئی
ہر طرف تاراجیاں تھیں ہر طرف غارت گری
چاٹ کر خوں روح سرمایہ تھی بولائی ہوئی
ہر نظر اژدر نفس تھی ہر زباں عقرب ضمیر
اک بہیمیت سی انسانوں پہ تھی چھائی ہوئی
اپنی ہی وسعت میں گم تھا کاروانِ زندگی
اپنے ہی طوفان میں تھی ناؤ چکرائی ہوئی
موت کا خونی پھریرا تھا فضا کے دوش پر
آخری ہچکی لبِ ہستی پہ تھی آئی ہوئی

کر چکا تھا ہضم امن عامہ کو شور و شین
دفعتاً گھبرا کے فطرت نے صدا دی یا حسین

یہ صدا اٹھتے ہی فطرت کے لب خوددار سے
جا کے ٹکرائی مدینے کے در و دیوار سے
تلملا اٹھا ضمیر جانشینِ مصطفیٰؐ
تیوریاں سرگوشیاں کرنے لگیں تلوار سے
آ ڈٹا دلبندِ حیدرؓ کربلا کے دشت میں
چھوٹ کر آرام گاہِ احمدؐ مختار سے

آہ، وہ دشتِ بلا وہ دھوپ وہ گرمی وہ لو
لونکلتی تھی زمیں سے سنگ سے اشجار سے
سرخ کرنوں کے لچکنے سے برستے تھے شرر
یا ابل اٹھا تھا دوزخ مہر آتشبار سے
اڑ رہے تھے شعلۂ براں کی صورت خار و خش
بھر کے بھوبھل دامنوں میں عرصۂ پیکار سے

اس سلگتی دوپہر میں اس دہکتی فصل میں
لڑ رہا تھا اک مسافر لشکر کفار سے
وہ حسینی دبدبہ وہ ہاشمی رعب و جلال
وہ کڑی چتون کہ رکھوالے سپر تلوار سے
تیوریوں کی آنچ سے تھرا رہا تھا آسماں
برق گھونگھٹ کھا رہی تھی ابروئے خمدار سے
کون لڑسکتا ہے یوں گھر کے ہجوم یاس میں
تین دن کی بھوک میں سولہ پہر کی پیاس میں

دیدنی ہے بیکسی میں اتنے خونخواروں سے جنگ
رہزنوں سے بدوؤں سے فتنہ آثاروں سے جنگ
امن کی خاطر بقائے حریت کے واسطے
ظالموں سے بدمعاشوں سے ستم گاروں سے جنگ
جادۂ تسلیم پر انسانیت کے نام پر
خونیوں سے بے حیاؤں سے سیہ کاروں سے جنگ
نوعِ انسانی کو غلامی سے چھڑانے کیلئے
دیوشاہی سے حکومت کے پرستاروں سے جنگ
بہرِ تکمیلِ محبت بہرِ استحکامِ حق
سرکشوں سے معرکہ، بدعہد غداروں سے جنگ
تشنگی میں، بھوک میں، بیچارگی میں یاس میں
خودسروں کا سامنا، سیراب میخواروں سے جنگ
نرغۂ اعدا میں اپنی جرأتوں کا امتحاں
خوں چٹائے خنجروں سے جنگ تلواروں سے جنگ
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہارِ حق
چھاؤں میں تیغوں کی بیدینوں سے زرداروں سے جنگ

آفتوں کی زد پہ نفس مطمئنہ کا ثبوت
آندھیوں سے زلزلوں سے شر سے، انگاروں سے جنگ

ہر طرف اک ہمہمہ تھا شور تھا کہرام تھا
اس پہ استقلال، یہ شبیرؑ ہی کا کام تھا
تا حدِ امکاں جفا پرور ستم ڈھاتے رہے
قلبِ زہراؑ و نبیؐ پر تیر برساتے رہے
خون کی ندی زمینِ گرم پر بہتی رہی
آسماں پر آتشیں طوفان منڈلاتے رہے
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ڈھالیں چار سو اڑتی رہیں
خون میں لتھڑے علم ہر سمت لہراتے رہے

فوج کی کثرت سے مقتل کی زمیں ہلتی رہی
خون کی شدت سے کوہ و دشت تھراتے رہے
خون پی پی کر لعینوں کا جنوں بڑھتا رہا
ظلم ڈھا ڈھا کر عرب کے دیو بل کھاتے رہے

سرکشانِ روم و رے حرص و ہوس کی چھاؤں میں
خنجروں کو تولتے برچھوں کو لپکاتے رہے
اپنے مرکز پر رہا پائے حسینؑ ابن علیؑ
آندھیاں اٹھتی رہیں اور زلزلے آتے رہے
بندۂ حق بے خطر اعلانِ حق کرتا رہا
لاکھ بے دیں خوں بھری تیغوں کو چمکاتے رہے
اتنا ہی ہوتا رہا محکم حسینی عزم بھی
جس قدر بیدرد بڑھ بڑھ کر ستم ڈھاتے رہے

اک مکمل درسِ عبرت ہے حسینؑ ابن علیؑ
کٹ گیا سر بیعت فاسق نہ کی آخر نہ کی

آفریں اے مردِ جرار و دلاور آفریں
آفریں دلبند زہراؑ و پیمبرؐ آفریں
تو نے رکھ دی کاٹ کر طوقِ غلامی کی گرہ
آفریں اے تیغ آزادی کے جوہر آفریں
آسماں کانپا زمیں اُلٹی قیامت پھٹ پڑی
رہ گیا تو اپنے ہی مرکز پہ جم کر آفریں
کھینچ لی کڑیل جواں بیٹے کے سینے سے سناں
ہاتھ بھی تیرے نہ کانپے ابنِ حیدرؑ آفریں
رو دیا تیرے مصائب پر زمانہ رو دیا
اور نہ چھلکے تیری ہی آنکھوں کے ساغر آفریں
دامن ہستی پہ تیرا خوں ہے اب تک لالہ کار
آفریں اے کشتۂ شمشیر و خنجر آفریں
لشکر و جاہ و علم سے یہ رجز خوانی تری
افسر و اورنگ پر یہ تند ٹھوکر آفریں
مرحبا اے سالکِ راہِ محبت مرحبا
آفریں اے حاملِ خلق پیمبرؐ آفریں

آفریں اے افتخارِ فاتحِ بدر و حنین
آفریں صد آفریں اے بیکس و تنہا حسینؑ

حریت کو آج بھی ہے ابنِ حیدرؑ کی تلاش
وقت کو پھر ہے کروڑوں میں بہتر کی تلاش
پھر بہیمیت کی آنکھوں میں اتر آیا ہے خوں
آدمیت کو ہے پھر نفس پیمبرؐ کی تلاش
پھر فضا میں کروٹیں لیتا ہے پرچم موت کا
زندگی کو پھر ہے اک جانباز رہبر کی تلاش
پھر جمائے ہے قدم تفریقِ نسل و رنگ میں
پھر اخوت کو ہے تیغ عزمِ سرورؑ کی تلاش
پھر گرجتا ہے خزانہ پھر بہکتی ہے ہوس
پھر حیاتِ دہر کو ہے آلِ اطہر کی تلاش
پھر سنبھل بیٹھی ہے قدرت پھر مشیت گرم ہے
پھر جوانی کھولنے کو ہے نشانِ حریت
پھر ہوئی ہے دوشِ عباسؑ دلاور کی تلاش
پھر جمعیت جاگ اٹھی ہے پھر ہے غربت گرم کار
پھر ہوئی ہے زندگی کو جوشِ اکبرؑ کی تلاش
پھر صدا دیتی ہے قاسم کو زمیں جنگاہ کی
پھر ہوئی ہے رزم گہہ کو عون و محمد کی تلاش
دیکھنا کیفیؔ نشانِ حریت لہرائے گا
جب جہاں کو عزمِ شاہ کربلا مل جائے گا

قرۃ العین حیدر کا مشہور رپورتاژ 'کوہِ دماوند' سے اقتباس

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے

لینن گراڈ میں لینن کے دفتر کی دیوار پر ان لوگوں کی تصاویر ہیں جو انقلاب میں مارے گئے۔ گول گول عینکیں لگائے سنجیدہ شکلوں والے انٹلکچوئل نیچے نیچے دبیز سائے بھدے کوٹ پہنے کھنچے ہوئے جوڑے باندھے انٹلکچوئل عورتیں۔ مجھکی ہوئی مونچھوں والے فوجی۔ سویلین سب۔

تو؟

تو کیا کچھ نہیں۔ اچھا سوچئے آپ خود اگر زنداں میں ہوں۔ سب اپیلیں مسترد۔ صبح چار بجے دروازہ کھلا۔ فرض کیجئے آپ محض شدید مداح اور ہمدرد ہونے کی بجائے اس مومن ملک کے شہری ہوتے اور کچھ ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی یا آپ کی بیوی بیٹی بھائی بہن، اس کی آنکھوں پر مگر آپ ایک اور ملک کے شہری ہیں اور آرام سے دھوپ میں بیٹھے قہوہ پی رہے ہیں اور آپ کے کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہے ہیں اور آپ کی زمینوں میں پنا کی کانیں نکل آئی ہیں۔ درست مگر اس دور سے پہلے جو ہزاروں کو مارا گیا آپ نے اس وقت احتجاج نہیں کیا۔

آپ کو کیا معلوم کہ نہیں کیا۔

کسی نے نہیں کیا۔ رہی ایمنسٹی انٹرنیشنل تو وہ سامراجیوں کی جماعت ہے۔ معاف کیجئے گا۔ کیا آپ بھی شیطان عظیم کی ایجنٹ ہیں۔

رمبا ہو ہو سمبا ہو ہو۔

آدھی رات کو ریڈیو پر عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ خلائے بسیط کے نقار خانے میں ہر ایک اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ کوہستان چلتان کے پردے سرحد کے اس پار سے مغربی آرکسٹرا مغربی فوجی دھن پر رجز، جوشیلی تقاریر۔ ایک مرتبہ اسی زبان کی ایک گمنام نشر گاہ پر سوئی لگ گئی۔ فریاد فریاد فریاد۔ ہم مارے جا رہے ہیں۔ سوئی لگنے ہی کی تو بات ہے۔ طاقتور آواز پر سوئی لگ جاتی ہے۔ کمزور آواز پر نہیں لگتی۔ فریاد فریاد۔

استخوانوں کے لرزنے کی صدا آتی ہے۔ قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔ بالکل نہیں آتی۔ اب تک تو نہیں آئی۔ بدلی نگاہبانوں نے چوکی، بچا پہر۔ تاریک خلا میں یہ آوازیں ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں یا Jam کر دی جاتی ہیں۔ سب بلیک ہول ہے۔

سب ہو گئے خاموش اسیران نوحہ گر۔ وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر۔ سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ استخوانوں کے لرزنے کی صدا۔

سزا دے دی گئی۔ واجب القتل تھے۔

جنگل جنگل صحرا صحرا رات کے اندھیرے اور دن کی چلچلاتی دھوپ میں جنگلی شہد کھاتا بھیڑ کی اون کا لبادہ پہنے یحییٰ جلتی ریت پر چلاتا پھرتا۔ خبردار وہ آ رہا ہے۔ وہ آ رہا ہے۔

لکھا ہے حسین نے دشت کربلا جاتے ہوئے چار ماہ کے کٹھن سر کے دوران یحییٰ کو اکثر یاد کیا۔

نہایت سادہ و رنگیں ہے داستان حرم۔

نجرانیوں کا ساتواں بیڑا نیلے پانیوں پر ہوتا ہے پھر رواں۔

وہ بڑا ہی حسین دیس ہے۔ مرے بھرے کوہستان۔ سیدار کے جھرمٹ، خوبصورت مسجدیں۔ قدیم خانقاہوں کی راہداریوں میں سایوں کی مانند چلتے راہب رات کے آسمان پر پورا چاند باغوں میں صنوبر۔

صنوبر چاند کنول بارش پھوار گلاب مور چاندنی قمری بہار شمشاد

دیکھئے ان چیزوں کے نام بھی اردو میں لکھے ہوئے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

گنگا جمنا سنگم

سنگم کے شہر میں پچھلے دنوں صنوبروں کے اس کوہ الم و وادیٔ محن کے محصور مظلوموں کی امداد کے لئے ایک جلسہ تھا۔ کچھ لوگ اس شہر کے بااثر مقتدر اہل ایمان کے پاس گئے۔ انہوں نے جواب دیا۔ آپ لوگ افغان مجاہدین کے لئے کیوں نہیں جلسہ کرتے۔

گزشتہ سال لب آب گنگ بجے جل ترنگ۔ پاٹلی پتر کے نکٹ۔ آستانہ شرف الدین یحییٰ منیری کے جوار میں مرمریں لبند و بالا راج بھون کی چھت پر وہ مرد خود آگاہ دھوپ میں نیم دراز تھا۔ (سنیں گے میری صدا خن زادگان کبیر؟ گلیم پوش ہوں میں صاحب کلاہ نہیں۔) پوچھا، لالہ و گل سے تہی نغمہ بلبل سے پاک اس منزل شاہین و چرغ اس کوہستان عظیم کی جہاں آپ مقیم ہیں۔ اصل صورت حال کیا ہے؟

فرمایا: بیٹی بے شمار مارے جا رہے ہیں جب وہ زندہ ہی نہ بچیں گے تو اس سے کیا غرض کہ کہ زاغ ہے یا ہمارے؟

دکھ سے فرمایا 'جوان مارے جارہے ہیں۔ میں تو پوچھتا ہوں کہ ان بے خانما عورتوں کا کیا ہوگا۔ وہ کہاں جائیں گی جن کے مرد بے دریغ مارے جارہے ہیں۔'

رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔

فاقہ کش تشنہ دہن کشتۂ غم لٹتے ہیں۔ شور برپا ہے یہ رانڈوں میں کہ ہم لٹتے ہیں۔

دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں۔ تیغ کھینچو کہ لعین گھر میں گھسے آتے ہیں۔

گولیاں جسم میں سوراخ بناتی ہیں، روحیں اس میں سے یا قبر کے غار سے نکلتی ہوں گی یا راکھدان سے (معاف کیجئے گا بلیک جوک ہوگیا) کہاں جاتی ہیں۔ اگر وہ ہیں ماہرین مابعدالطبعیات، جزویٹ فادرز، علماء وصوفیا ویدانتیوں گیان مارگی جوگیوں Jetset رشیوں سے ایک مودبانہ سوال، کہاں جاتی ہیں جلدی بتایئے۔ گنہگاروں کے لئے چاہ ہب ہب۔ شہدا کی روحیں جاکر سدرہ وطوبیٰ کی شاخوں پر بیٹھ گئیں۔

قرطبۂ ہند کا ایک بوڑھا مونگ پھلی بیچنے والا تہجد گزار، فصیح وبلیغ اردو بولنے والا ایک روز وثوق سے بتا رہا تھا۔ حوض کوثر کے کنارے جو جنتی پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب ایک مومن کی دعا آسمان پر پہنچتی ہیں۔ وہ حوض کوثر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ ان کے پروں سے جو بوندیں گرتی ہیں، وہی دعائیں ہیں جو موتی بن گئیں۔

سامنے سے ایک بس آرہی ہے۔ گرد اڑاتی ہوئی۔ ڈبائی کی سمت رواں۔ اس نے گھبرا کر ایک ٹھیلہ ایک طرف کو کیا۔ دوسری بس گزرتی ہے۔ لدی پھندی، سجی سجائی۔ اس پر پوسٹر چسپاں ہیں۔ Rashid Weds Jamila چھت پر جہیز کا بے تحاشا قیمتی سامان۔ یہ بسیں اور پوسٹر مسلمان کاروباریوں کے لئے نئے تمول کے معلن ہیں۔ سہالک کا موسم گزر گیا لیکن ایک اور بس نکلتی ہے پوسٹر Mohan Weds Kamla چھت پر جہیز کا بے تحاشا سامان، دلہن واجب القتل ہے۔

مجھ مفلوک الحال آدمی کو کبھی یتیم نواسی کے جہیز میں ریڈیو، سائیکل، برقی پنکھا سب چیز دینی پڑی۔ لڑکا تو ہیرو موپڈ مانگ رہا تھا۔ میں کتنا قرض لیتا، ٹھیلے والے نے کہا۔

درگاہوں پر بھیڑ۔ بس ایک کلر ٹی وی سیٹ۔ ایک وی سی آر۔ ایک پرئمیر پدمنی کار کا سوال ہے بابا۔

پچھلے دنوں ہم پدمنی کے دیس گئے تھے۔ کھچا کھچ بھری عوامی بس پر راستے میں پہاڑوں کے قریب بس رکی۔ چند غریب ہندو عورتیں اتر کر تانگے میں بیٹھیں۔ تانگہ طویل سڑک پر پہاڑیوں کی سمت ٹخ ٹخ کرتا چل دیا۔ بس کے اندر ایک غریب ہندو عورت نے کہا۔ وہاں پہاڑیوں کی پلی کی طرف بالاجی کا مندر ہے۔ کسی نے کچھ کیا ہو، دھرا ہو، سب وہاں اتر جاتا ہے۔

برابر کی سیٹ پر ایک بکر وقصاب رونق افروز۔ کلائی پر رنگین الکٹرانک گھڑی، ہاتھ میں کیسٹ پلیئر 'یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے' بڑے انہماک سے آنکھیں بند کئے سن رہا تھا۔ دوسری طرف ایک نوجوان فربہ لالہ جی۔ ایک برقعہ پوش عورت اور اس کا شوہر۔ رہبر کولر اور اور چمکیلی الکٹرانک گھڑیوں سمیت۔ وہ سب گانا سننے میں مشغول تھے۔ بالاجی کے نام پر لالہ جی متوجہ ہوئے۔ ایک یہ بالاجی کا مندر جب حکم ہوتا ہے تبھی کوئی ان کے دوار پہنچ سکتا ہے۔ اور ایک 'دشمنوں میں ہزاروں من گھی جلوا ڈالا پر بائی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سفید مونچھوں اور بھاری پگڑی والے ایک بوڑھے نے کہا۔ اس نے کانوں میں سونے کی مندریاں پہن رکھی تھیں۔'

دیوی کا پروان ہے۔ مہارانی سے چکی پسوا دی۔ لالہ نے کہا۔

قصائی نے جانکاری سے سر ہلایا۔ خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری دیویں ہیں بربّر۔

نیم والے بابا کے دھورے منتریوں کی موٹریں پہنچ گئیں۔ الیکشن آنے والا ہے۔

بادشاہی کھیل ہیں۔ ذرا راجپوت فلم کا گانا لگیو ماسٹر۔ تیری گلی سے جب میں نکلا۔

نیم والے بابا بڑے غصیلے آدمی ہیں۔ ڈانٹ دیں تو سمجھو بیڑا پار۔

آدمی؟ ذرا زبان سنبھال کر بات کرو لالہ۔ اتنے بڑے اولیاء اللہ کو آدمی کہو ہو۔ جلالہ بزرگ کہو۔

بکر قصاب نے طیش سے جواب دیا اور دوسرا کیسٹ لگایا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ تیری گلی سے جب میں نکلا، سب کچھ دیکھا، بدلا بدلا میرے سنگ سنگ آیا۔ تیری یادوں کا میلہ۔

پنک سٹی کے ایک بازار میں مغلیہ پوشاک میں ملبوس چند طویل القامت مسلمان عورتیں بے پردہ۔ سرخ نیم جامہ، نیلی پشواز مغل راجستھانی تصاویر میں سے گویا کود کر باہر آگئیں۔ سڑک پر چل رہی ہیں۔ مزید اسی حلئے کی عورتیں جگہ جگہ۔ اے لو وہ تو سنیما گھر میں گھس گئیں نہ ان کو ناک کان کٹوائے کجانے کا ڈر نہ خوف۔ یہ کون لوگ ہیں، دوستو یہ کون سا دیار ہے۔

پہلے انہوں نے بجلی گھروں پر قبضہ کیا پھر دوا و غذا کی ناکہ بندی۔ پھر پانی بند کیا۔

بیکس ہیں مسافر ہیں وطن دور ہے گھر دور۔ ہفتم سے ہمیں گھیرے ہے یہ لشکر مقہور

تھا شور پیاسوں کو نہ پانی کا ملے جام۔ دم لینے کی مہلت نہ ملے بے وطنوں کو

مرتے ہیں زبانوں کو نکالے ہوئے بچے۔ ہے ہے مری آغوش کے پالے ہوئے بچے۔

مرحب نے اس گھڑی کیا سامان رزم گاہ۔ شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں۔ دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں۔ کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی۔ جنگل میں برق خوف خدا کوندنے لگی۔

اب دشت ودریا پر ۱۴۰۳ھ کا نیا چاند طلوع ہورہا ہے۔ ہجرت کا نیا چاند۔ شہر بنارس میں استاد بسم

اللہ خاں نے اپنے آبائی امامباڑے کے تعزیوں کے سامنے بیٹھ کر شہنائی پر غمگین راگ چھیڑ دئے۔ امامباڑہ حسین آباد لکھنؤ کے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے جگمگاتے آراستہ، انگلستان و کینیڈا اور امریکہ کے سینٹرلی ہیٹڈ نفیس عزاخانوں میں مرثیہ خوانی شروع ہو چکی۔ جاتا تھا یوں غضب میں صف اہل کید پر۔ شیر ژیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر۔ نکلا ادھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا۔ پیدل ہو یا سوار وہ دو تھا یا چار تھا۔ کوسوں لہو سے دشت ستم لالہ زار تھا۔ ایک شور تھا کہ موت کا عرصہ قلیل ہے۔ پیاسوں پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے۔

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک ناتواں کے پاؤں۔ اٹھ اٹھ گئے سپاہ ضلالت نشاں کے پاؤں۔ اک تہلکا سا مچ گیا کون و مکان میں۔ کس طرح وہ آسکے شجاعت بیان میں۔ ایسا لڑا نہیں کوئی پیاسا جہان میں۔

گوشوں میں جا چھپے تھے کماندار دس ہزار۔ چادر ہلا رہے تھے شجاعان نامدار۔ خود صاحب کمند اسیر کمند تھے۔ دم خنجروں کی تیغ کی دہشت سے بند تھے۔

لیکن واممحمدا! واحسینا! کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ اب وہ سب بندوقیں سنبھالے دشت غربت میں منتشر کئے جانے کے لئے ٹرکوں پر سوار کئے جا رہے ہیں۔ وہ بندرگاہ لے جائے گئے۔ ایک اور ہجرت پر مجبور۔ پینتیس سال بعد ایک اور ہجرت۔

جگمگاتی مرادآبادی صراحیوں اور فیروزآبادی جھاڑ فانوس سے آراستہ طلائی محلوں میں کشمیری قالینوں پر نیم دراز شیوخ الف لیلیٰ جدید نے ہاتھ بڑھا کر رنگین ٹی وی پر دوسری چینل لگائی۔ محاصرے قتل و غارت قید و بند اور ہجرت کے مناظر غائب۔ اب وہ نامور بیلی ڈانسر نبیلہ کا نیم عریاں رقص ملاحظہ کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی طیارے باہر موجود ہیں۔ جو کل سویرے ان کو مونٹ کارلو اور بیرس لے جائیں گے جہاں کے قحبہ خانے ان کے منتظر ہیں۔

ہے کوئی مائی کا لال جو انہیں سنگسار کر سکے؟

جہازوں نے لنگر اٹھائے۔ کشتیٔ نوح چھوڑ کر طوفاں ہوا رواں۔ ماہی نے الحفیظ کہا مہ نے الاماں۔ پرواز شاخ سدرہ سے کی جبرئیل نے، محراب سے بلند کیا سر خلیل نے۔ وہ سرفروش جانباز حقیقی مجاہد، اپنی بندوقیں ہوا میں سر کرتے ایک اور ہجرت پر مجبور ہوئے۔ شکستہ دروازوں میں ان کے بوڑھے ماں باپ بیوی اور بچے سرنگوں۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پر۔ تم چھوٹتے ہو واجب القتل ہیں۔

حیا کے مارے کئے گردنوں کو خم آئے۔ قدم قدم پہ اٹھاتے غم والم آئے۔ بلاکشوں نے مکان رہنے کو نہ پایا تھا۔ بجز فلک نہ شجر۔

پڑھنے لگا رجز کے ہوں حیفہ کا پہلوان۔ نوکوں سے برچھیوں کی کلیجہ نکال لوں۔ نوکوں سے۔

استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔

واجب القتل ہیں۔

جلاد آستینیں چڑھاتا ہوا چلا۔ خنجر پر انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا۔ مجمع کو راس و چپ سے ہٹاتا ہوا چلا۔ آسمان سے یہاں مسلسل چار ماہ تک آگ برسی ہے۔ آسمان کی آگ اور زمین کی آگ۔ گبرئیل کوہن اسٹوری فائل کرتا ہے۔ عمر میں پہلی بار دیانت داری سے۔

فاقہ کش تشنہ دہن کشتۂ غم لٹتے ہیں۔ دشت غربت میں گرفتار ستم لٹتے ہیں۔

قتل وارث ہوئے سامان گرفتار ہے۔ یا علی آیئے سامان۔

ہے فریاد کسی کی کہ برادر دوڑو۔ کوئی چلاتا ہے عباس دلاور دوڑو۔ دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں۔ تیغ کھینچو کہ لعیں گھر میں گھسے آتے ہیں۔

اس مصیبت میں نہ آئے تو کب آؤ گے۔ سر سے چادر مری چھن جائے گی تب آؤ گے۔

کوئی نہیں آیا مدد کے لئے کوئی نہیں آیا۔

گبرئیل کوہن اسٹوری فائنل۔

پرمباہ نبی نے تین ہزار سال قبل نوحہ کیا تھا۔

کرنل ڈویر یرمیا ہو آج نوحہ گر۔

ان گنت یتیم و پسر معذور اور زخمی بچے۔ ہند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری۔ رو کے پوچھا کہ دوا کیا ہے کہا نوحہ گری۔

انہوں نے میرے ابا اور اماں کو مار دیا۔ باقی سب کو پکڑ کر لے گئے۔ گھر لوٹ لیا، گھر میں میں اور بے بی اکیلے بچے ہیں۔ میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں پانچ سال کا ہوں۔

دہشت زدہ محیر بے خانماں بے سہارا بچے۔ ہند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری۔ گھر جو دریافت کیا کہنے لگے دربدری۔ بولی لیتا ہے خبر کون کہا بے خبری۔

مکاناں پر بل ڈورز رچل گئے۔ مکاناں پر بل ڈورز رچل رہے ہیں۔ گبرئیل کوہن آج ان کے متعلق اسٹوری۔

ملنے کے ڈھیر لاشوں کے انبار۔ جلے ہوئے گھر، غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں۔ ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں۔

وہ شب کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں۔

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار۔ جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار۔

ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں۔ گود میں ماؤں کے دہشت سے چھپے جاتے ہیں۔ ننگی تلواریں جو ظالم انہیں دکھلاتے ہیں۔ بس تو چلتا نہیں اشک آنکھوں میں بھر جاتے ہیں۔

نہ تو کر سکتے ہیں فریاد نہ رو سکتے ہیں۔ چپکے سہمے ہوئے اک ایک کا منھ تکتے ہیں۔

ملبے میں ہر طرف کھلونے اور ننھے منے جوتے

اور ننھے منے کپڑے۔

کل مجھے لوٹ کا اسباب جو دکھلایا تھا۔ اک پھٹے کپڑے پر حاکم کو بھی غش آیا تھا۔ ایک علم تھا اسی اسباب میں خورشید نشاں۔ مشک پنجے میں بندھی، خوں میں پھریرا افشاں، ایک گہوارے کی خوشبو سے یہ ہوتا ہے عیاں۔ کہ ابھی اٹھ کے سدھارا ہے کوئی غنچہ دہاں۔

بیچ میں تکیوں کے ننھا سا شلوکہ دیکھا۔ دودھ اگلا ہوا اور داغ لہو کا دیکھا۔

ایک سات سالہ بچی دہشت زدہ اپنے کھنڈی مکان میں لاشوں میں گھری ایک خالی ٹین کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اچھی نہیں یہ عادت نہ رویا کرو بی بی۔ پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی۔ کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں۔ مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں۔

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی۔ برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی۔

ہزاروں ہزار یتیم بے خانماں بچے۔

بیٹی کے سوا آپ کا کوئی نہیں بابا۔ شب میں میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا۔

میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں صرف پانچ سال کا ہوں۔

بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے۔

استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے چینل بدلئے۔

مگر اس چینل پر کوئی تصویر نہیں سناٹا ہے۔

سناٹا؟ جی نہیں یہاں سب خیریت ہے برضائے الٰہی، منافقین اور زمین پر فساد پھیلانے والوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ واجب القتل تھے۔ جو باقی ہیں انشاء اللہ ان کو بھی۔

قید خانوں میں اسیر منتظر اجل ہیں بیٹھے ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی اور بندوقچوں کی گولیوں کی باڑھ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو آنے کی اجازت نہیں۔ وہ شیطان عظیم کے کارندے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔

ہند ہرگز نہیں آئے گی۔ کاہے کو آنے لگی۔ سب کو اپنے اپنے قومی مفاد کا خیال ہے صاحب لائن سے اپنی قبریں کھود کر سب اس قطار میں آجائیں۔ جلدی جلدی۔ افراتفری نہیں سستی نہیں ڈسپلن آخر دم تک ضروری ہے۔ کچھ کفن کے لئے ہمراہ نہیں لایا ہوں۔ باپ کو چھوڑ کے بے گور و کفن آیا ہوں۔

فکر مت۔ کفر سرکاری ملیں گے۔ پھاوڑے قرینے سے رکھ دیجئے۔ دوسرے آرہے ہیں۔

کاؤنٹ ڈاؤن۔ دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین

قید خانے میں کمسن لڑکے لڑکیاں منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ دنیا کے ایوانوں میں اقتدار کی راہداریوں میں ان کی آواز نہیں پہنچتی کوئی ان کو چھڑانے نہیں آیا۔

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر۔ دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در۔ پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر۔ دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر۔ بس کس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں۔ کچھ تجھ سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں۔

چھوٹے سے سن میں قیدیٔ زندان شام ہوں۔ میں دختر حسین علیہ السلام ہوں۔

کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا۔ چھٹ جائیں گے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا۔

کھانے کو کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا۔ ہاں قفل کھول دو گے تو دوں گی تمہیں دعا۔

جائیں گے ہم کہاں کہ تمہارے ہوا لے ہیں۔ بابا حسین آج کی شب آنے والے ہیں۔

اصغر ہیں ان کے ساتھ یقیں ہے کہ جلد آئیں۔ ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رلائیں۔ چوکی کے لوگ سوتے ہیں در پر مجھے بٹھائیں۔ دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آ کے پھر نہ جائیں۔ نیند آئے گی نہ مجھ کو بہت بے قرار ہوں۔ بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں۔

موقوف ان پہ میری حیات و ممات ہے۔ آنے کا ہے یہ دن یہی وعدے کی رات ہے۔ بولی نگاہیاں کہ ترا دھیان ہے کدھر۔ ماں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر۔ دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے۔ نہ ہم کو سونے دیتی نہ آپ سوتی ہے۔ بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لئے۔ رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لئے۔ ماں سے چھٹے تو اور صدمہ دو چند ہو۔ ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو۔

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار۔ دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار۔ دالان سے پکاریں یہ بانوئے نامدار۔ بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار۔ کھولے گا کون کون در کسے چلاتی پھرتی ہوں۔ واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو۔

زنجیروں کو نہ رات کو کھولیں گے یہ لعیں۔ ماں صدقے گئی گھڑکیاں کھانے کو کیوں گئیں۔ پست و بلند خانۂ زنداں کی ہے زمیں۔ گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں۔

روتی ہوئی یہ کہہ کے اٹھیں بانوئے حزیں۔ بیٹی کو ڈھونڈھتی ہوئی دروازے تک گئیں۔ روتی تھی منھ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں۔ پاس آ کے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں۔

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

.....

جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

❑❑❑

عصمت چغتائی کے مشہور تاریخی ناول 'ایک قطرۂ خون' سے اقتباس

آخری شمع

نویں تاریخ آل حسین پر وہ قہر لے کر آئی کہ الامان! بچوں میں اب رونے کا بھی دم نہ رہا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سیدھے دیکھتے ، خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے پھر غشی طاری ہوجاتی۔ بانو کا دودھ خشک ہو چکا تھا۔ جھولے میں چھ ماہ کا نازک بچہ 'معصوم' اصغر پیاس سے نڈھال تھا۔ عباسؓ کا نور نظر تڑپ رہا تھا۔ سکینہ بلک بلک کر دم بھر کر خاموش سہم کر رہ گئی تھیں۔ خیموں کے باہر تو آگ برس رہی تھی۔

شام ہوتے ہی ابن سعد نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور حسینؓ پر حملہ کر دیا۔ حسینؓ عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازے پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ تھکان سے نیند کا غلبہ تھا۔ کچھ پیاس کی بے ہوشی طاری تھی۔ اچانک حملہ ہوگیا۔ ابن سعد نے چلے پر تیر جوڑ کر آل رسولؐ کے خیموں کی طرف مارا اور چلایا۔

'لوگو' گواہ رہنا' پہلا تیر میں نے ہی مارا ہے۔'' سب نے اس کی بہادری اور جواں مردی کی خوب جی کھول کر داد کی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان کربلا ہلنے لگا۔ فوج کا شور سن کر زینبؓ گھبرا گئیں۔

''بھائی حملہ ہوگیا!''

امام نے چونک کر آنکھیں کھولیں بہن کو تسلی دی۔ ''خاموش رہو زینبؓ'' یہ حواس کھونے کا وقت نہیں۔ ابھی میری جو آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھا نانا جان کھڑے ہیں۔ کہہ رہے ہیں ''حسینؓ کب آرہے ہو؟''

زینب منہ ڈھانک کر رونے لگیں۔ اتنے میں عباس بھی آ گئے۔

''کیا حکم ہے آقا؟''

''قربانت شوم' ذرا جا کے ان لوگوں سے پوچھو' یہ اچانک حملہ اور وہ بھی بچوں اور عورتوں کے خیموں پر یہ عرب قوم کی رسم تو نہیں۔ اعلان جنگ کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ ایک دم حملہ کر دیا۔''

> عذرہ بن قیس نے جھلا کر کہا۔ ''حبیب تم کو کبھی علی اور آل علی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تم تو عثمانی جماعت سے تعلق رکھتے ہو۔ تم کیوں حسین کے پیچھے اپنی جان کے دشمن ہوگئے۔ تم تو شام والوں کے ہم خیال ہوا کرتے تھے۔ اس عجیب و غریب تبدیلی کی وجہ؟''
>
> حبیب ابن مظاہر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''تم کہتے ہو تو سوچتا ہوں' واقعی مجھے حسین سے دشمنی نہ سہی کبھی کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ نہ میں نے انہیں جانے کے لیے خط لکھے۔ نہ کبھی ان کی حمایت میں آواز اٹھانے کا خیال آیا۔''
>
> ''پھر اس کایا پلٹ کی وجہ؟''

عباس نے بیس سوار لیے اور دشمن کی طرف چلے' انہیں آتا دیکھ لشکر نے ہاتھ روک لیے۔ سمجھا شاید صلح کا پیغام لے کر آرہے ہیں۔ کسی کا دل اس جنگ میں نہ تھا۔ سب کچھ عاجز سے ہو رہے تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی جنگ تھی۔ صلح کا بہانہ پا کر حملہ روک دیا۔

''امیر ابن زیاد کا ابھی حکم آیا ہے کہ حسین بن علی بن ابی طالب سے خلیفہ کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر انکار کریں تو وقت ضائع کرنے اور تاخیر کرنے سے کیا حاصل، جلد از جلد فیصلہ ہوجانا چاہئے۔''

''ذرا صبر کرو' میں تمہارا پیغام اپنے امام کو پہنچا کر ابھی ان کا جواب لاتا ہوں۔''

عباس سرپٹ گھوڑا دوڑاتے واپس پلٹے۔ جو اصحاب ساتھ گئے تھے وہ وہیں ٹھہرے رہے۔ یونہی بات چل نکلی۔ حبیب بن مظاہر فوجیوں کے ایک ممتاز گروہ سے کہنے لگے۔

''یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو، پیغمبر خداؐ کے پیارے نواسے کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہو۔ للہ کچھ تو سوچو سمجھو' حسین اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ان گنت خوبیوں کے مالک' عبادت گزار اور پرہیز گار۔ انہیں کس جرم میں قتل کر رہے ہو؟''

''انہوں نے بیعت سے انکار کیا!''

''بیعت سے انکار جرم نہیں۔ بیعت نام ہے آزاد رائے کا جس کا جی چاہے کرے ورنہ انکار کر دے۔ بارہا ایسا ہو چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے بیعت نہیں کی' ان سے کبھی کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔''

''یہ ہم نہیں جانتے' ہم فوجی ہیں۔ سیاست داں نہیں۔'' انہوں نے کچھ تردد کے بعد جواب دیا۔

''خلیفہ کو اکثریت کی بیعت حاصل ہے۔'' عمرو بن سعد نے جواب دیا۔

''اگر اکثریت خلیفہ کے ساتھ ہے تو پھر وہ ایک حسینؓ کی بیعت پر کیوں مصر ہیں؟''

''آپ یہ سوال ہم سے کیوں کر رہے ہیں؟''

''کیوں کہ وہ تلواریں جو حسین کے خلاف اٹھ رہی ہیں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟''

عذرہ بن قیس نے جھلا کر کہا۔ ''حبیب تم کو کبھی علی اور آل علی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تم تو عثمانی جماعت سے تعلق رکھتے ہو۔ تم کیوں حسین کے پیچھے اپنی جان کے دشمن ہو گئے۔ تم تو شام والوں کے ہم خیال ہوا کرتے تھے۔ اس عجیب و غریب تبدیلی کی وجہ؟''

حبیب ابن مظاہر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''تم کہتے ہو تو سوچتا ہوں' واقعی مجھے حسین سے دشمنی نہ سہی کبھی کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ نہ میں نے انہیں جانے کے لیے خط لکھے۔ نہ کبھی ان کی حمایت میں آواز اٹھانے کا خیال آیا۔''

''پھر اس کایا پلٹ کی وجہ؟''

''راستہ میں ملاقات ہو گئی' انہیں دیکھ کر بے ساختہ رسول اللہ یاد آ گئے۔ وہ حسنؓ و حسینؓ سے کس درجہ محبت کرتے تھے اور جب حسینؓ نے بتایا کہ حالات کس درجہ ان کے خلاف ہیں تو میرا جی نہ مانا کہ منہ چھپائے بیٹھا رہوں اور میرے آقا کے نواسے یوں صحراؤں کی خاک چھانیں۔ پھر جب حسینؓ نے ساتھ چلنے کو کہا تو جی نہ مانا اور بخوشی تیار ہو گیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔''

''مگر ہم نے تو سنا ہے حسین بجائے فوج جمع کرنے کے ساتھ آنے والوں کو سمجھا بجھا کر لوٹا دیتے ہیں۔ وہ آپ کو کیوں ساتھ آنے کی دعوت دیتے۔ جب کہ آپ معاف کیجئے گا اتنے ضعیف بھی ہو چکے ہیں کوئی خاص معرکہ تو سر نہ کر لیں گے۔''

''ہاں یہ بھی تو م ٹھیک کہتے ہو' مگر ضرور کوئی مصلحت ہو گی۔ اور رہی میرے بڑھاپے کی بات تو اگر حسینؓ مجھے نکما سمجھتے تو ساتھ کیوں لاتے اس لیے ضرور کوئی خاص بات ہے جو انہوں نے مجھے منتخب کیا۔ خیر تم خاطر جمع رکھو' اس پڑھاپے میں بھی تم جیسے روباہ خصلت پہلوانوں کے چھکے چھڑا سکتا ہوں۔''

''ارے اس پڑھاپے میں تو کونے میں بیٹھ کر عبادت کیجئے۔''

''حسین جیسے انسان پر جان قربان کرنا خود ایک عظیم عبادت ہے۔ وہ انسانی حقوق جو خدا نے انسان کو سونپے ہیں اگر کوئی شیطان صفت ہم سے چھیننا چاہئے اور ہم دم سادھے بیٹھے رہیں۔ یہ ہماری بزدلی اور نکمے پن کا ثبوت ہو گا۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عباس آ گئے۔

''امام فرماتے ہیں کہ شب بھر کی مہت دو صبح جو جی میں آئے کرنا تمہیں اختیار ہو گا۔''

شمر ذی الجوشن کو عمرو بن سعد پر جاسوسی کرنے کے لیے تعینات کیا گیا تھا کہ اگر ان کے رویہ میں ذرا بھی نرمی نظر آئے تو فوراً ان کے خلاف حفاظتی قدم اٹھایا جائے۔ انہیں شمر کی صورت سے وحشت ہو رہی تھی۔ اپنی فرماں برداری ظاہر کرنے کے لیے حسینؓ کے خلاف اور زیادہ سختی سے کام لے رہے تھے۔ تاکہ شمر مخبری نہ کر دے کہ ان کے دل میں آل رسول کے لیے جگہ ہے۔ انہیں اپنے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ وہ شہنشاہ جو دغا اور فریب سے غداروں اور نمک حراموں کی مدد سے تاج و تخت حاصل کرتے ہیں انہیں کبھی ان پر بھروسہ نہیں ہوا۔ وہ سمجھتے ہیں یہ حوالی موالی سب بیکار ہیں۔ صرف مکر و فریب ہی سے حکومت حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہیں چاروں طرف مطلبی اور دھوکہ باز ہی نظر آتے ہیں۔ جس پر ذرا سا بھی شبہ ہو فوراً قتل کر دیا جاتا ہے۔ یا انہیں ایک دوسرے پر جاسوسی کرنے اور ہر قول و فعل پر نگاہ رکھنے کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح بھائی بھائی کا دشمن ہو جاتا ہے۔ مخبری سے عروج اور عہدے ملتے ہیں۔ سلسلہ اوپر تک پہنچا ہوا تھا۔ اس ماحول میں حسینؓ ابن علیؓ کے وجود کی کوئی کھپت نہ تھی۔ شمر کی خوشنودی حاصل کرنے لیے وہ ہر بات میں اس کی رائے لیتا تھا کہ کبھی لپیٹ میں آ جائیں تو اپنے ساتھ اسے بھی گھسیٹ لے جائیں۔ جب امام حسین نے ایک شب کی مہلت مانگی تو پوچھا ''شمر تمہاری کیا رائے ہے؟''

''مہلت دینا پڑے گی، عرب قوم پناہ مانگنے والے کو پناہ دینے سے گریز نہیں کرتی۔ ایک شب کہ مہلت کے لیے انکار کر دینا ہمارا دستور نہیں۔ کافر بھی مہلت مانگتے تو دینا پڑتی یہ تو پیغمبر خدا کے نواسے ہیں۔''

غرض ایک شب کی مہلت مل گئی اور بڑھتی ہوئی فوج اطمینان کا سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

مگر سب سشں و پنج میں پڑ گئے۔ امام نے یہ مہلت کیوں مانگی؟ کیا کہیں سے فوج آنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں؟

حسین ابن علی نے جو اپنی خود داری کو بالائے طاق رکھ کر ظالموں سے ایک شب کی مہلت مانگی تو اس لیے نہیں انہیں کہیں سے فوجی امداد کی امید تھی یا اپنی مختصر سی فوج کو کچھ جنگی ہدایات دینی تھیں۔ وہ تو بس یہ آخری شب اپنے دوستوں اور عزیزوں کی صحبت میں گزارنا چاہتے تھے۔ پھر ہنگامہ جنگ میں کب مہلت ملے گی۔

جب شہزادی شب' خاندان سادات کی زبوں حالی پر گریاں' ماتم کناں سیاہ زلفیں بکھرائے ہوئے آئی تو ہر چہار طرف غل ہوا۔ ''لو پیاسے حسین کی شہادت کی رات آ گئی۔ جناب امیر کی روح پیاسی اور بے قرار میدان کربلا میں سرگرداں تھی۔ فضا سوگوار تھی۔ اس رات پیغمبر اسلام کے خاندان نے کیا کیا صعوبتیں اور غم سہے! خدا دشمن کو بھی ایسی اندھیاری رات نہ دکھائے۔''

غم و اندوہ سے چاند کا چہرا اترا تھا ہوا تھا۔ ستارے مردہ انسانوں کی بے نور آنکھوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ حور و غلمان ماتم کناں تھے، خدا ایسی ہول ناک شب پھر نہ لائے۔

آل رسول کے خیموں پر غم و ہراس کے بادل

چھا رہے تھے۔ فضا میں ہل چل تھی۔ آندھی ایسے جی چھوڑ کے چل رہی تھی کہ دل تہ و بالا ہوئے جاتے تھے۔ چراغ بجھے جاتے تھے۔ ہر چہار طرف خاک اڑ رہی تھی۔ درندوں کی دہاڑ سے سہمے ہوئے بچے ماؤں کی گود میں سمٹ آئے تھے۔ ہر لحہ یہی لگتا تھا کہ اب ڈر سے ان کا دم نکل جائے گا۔ بیبیاں خاموش آنسو پیئے، بچوں کو کلیجے سے لگائے بہلا رہی تھیں۔ دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ سب سے زیادہ زینبؓ بنت علیؓ مضطرب تھیں۔ سر شام ہی سے منہ اترا ہوا تھا۔ مسلسل آنکھوں سے خون کے آنسو جاری تھے۔ جان حزیں پر ایک کرب سا طاری تھا۔ کبھی تڑپ کر اٹھ بیٹھیں، پھر تھک ہار کر گر جاتیں۔ جب کلیجہ پر چھریاں سی چل رہی ہوں تو چین کیسے آ سکتا ہے۔

اس وقت سب دوست 'احباب' بھانجے' بھتیجے اور بیٹے حسین کے وسیع خیمے میں جمع تھے۔ جنہیں اندر جگہ نہ ملی وہ ادھر ادھر کھڑے یا بیٹھے تھے۔ خیمے کے سب پردے اٹھا دئے گئے تھے۔ امام کے ایک پہلو میں علی اکبر تھے دوسرے بازو قاسم ابن حسن تھے۔ عباس کے چھوٹے بھائی جعفر، عبداللہ اور عثمان بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ہی عون اور محمد بیٹھے تھے۔ خود عباس سامنے مودب دوزانوں بیٹھے تھے۔

سب نے یک زبان ہو کر بار بار وفاداری اور جان نثاری کی قسمیں کھائیں۔ امام حسینؓ ابن علیؓ نے بڑے پیار سے اپنے عزیزوں اور دوستوں پر نظر گھمائی۔ ان کا مرجھایا ہوا چہرہ یک لخت تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

''تاریخ گواہ ہے کہ میرے دوستوں جیسے مخلص دوست اور میرے عزیزوں جیسے پیارے کبھی یوں ایک جا جمع نہیں ہوئے۔ آج تمہیں اپنے پاس پا کر مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو رہا ہے۔ میرا سر غرور سے بلند ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ تمہاری غم خواری اور محبت سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے کوئی لشکر نہیں' کوئی ہتھیار نہیں۔''

پھر حسین نے حکم دیا۔ سب چراغ گل کر دئے جائیں۔ اندر باہر گھور اندھیرا چھا گیا۔ صرف امام کی آواز ایک نورانی آبشار کی طرح خاموشی کو اجاگر کرتی رہی۔

اس وقت جو کچھ تم مجھے دے رہے ہو اس کا نعم البدل نہیں۔ خدا ہی میرا یہ قرض اتار سکتا ہے۔ ابھی تک تو مجھے کچھ موہوم سی امید تھی کہ حالات زیادہ خراب نہ ہوں گے۔ وطن چھوڑ دینے کے بعد مجھے دنیا چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ میں سکون سے ایک غیر معروف کونے میں ایک پر امن شہری کی زندگی گزار سکوں گا۔ لیکن اب یہ امید بھی ختم ہو گئی۔ بس اب میں تم سے اپنے عہد و پیمان اٹھائے لیتا ہوں۔ تمہیں اطاعت کے بار سے سبک دوش کرتا ہوں اور بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تمہیں جس طرح پناہ ملے چلے جاؤ۔ رات کا وقت ہے۔ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اسے غنیمت سمجھو' اپنی اپنی سواریاں تیار کرو اور صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ، تم میں سے ہر شخص میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ لے اور مختلف شہروں کی طرف روانہ ہو جائے۔ یہ لوگ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں۔ جب مجھے پالیں گے تو تمہارا پیچھا نہ کریں گے۔ عزیزوں! میں نے چراغ گل کر دئے ہیں۔ اس اندھیرے میں کوئی کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔ مروت کا احساس قدم نہ روکے گا۔

خیمے میں خاموشی طاری رہی۔ نہ سرسراہٹ ہوئی۔ نہ کسی نے پہلو بدلا۔ صرف حسین کا دل دھڑک رہا تھا۔ سانس تک کی آواگون رک گئی تھی۔ امام نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک شمع روشن کی۔ اس آخری شمع کی روشنی میں جو امام نے اپنے ہاتھ سے آخری بار روشن کی انہوں نے دیکھا سب اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کوئی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

خیمہ میں سناٹا چھایا رہا۔ جذبات کی فراوانی نے زبانیں بند کر دیں۔ پھر عباس نے عزیزوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔

''خدا نہ کرے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔''

پھر مسلم بن عوسجہ نے کہا۔

''یا حسین'' خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ آپ کے دشمن میرے دشمن ہیں۔ جب تک میرے ترکش میں تیر ہیں۔ ہاتھ میں نیزہ اور تلوار ہے میں ان نابکاروں سے لڑتا رہوں گا۔ اگر میرے ہتھیار ناکارہ ہو گئے تو ان پر پتھر برساؤں گا، اگر مجھے ستر بار قتل کیا جائے پھر دوبارہ زندہ کر کے میرے جسم کو شعلوں کی نذر کر دیا جائے، پھر جل جانے کے بعد میرے راکھ کو دشت و بیابان میں منتشر کر دیا جائے، تب بھی میں آپ کے دشمنوں سے لڑتا رہوں گا۔ آپ کا ساتھ میں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ ہم میں سے کسی کو اپنی جان آپ سے زیادہ پیاری نہیں۔ اس جنگ سے ہٹنا اپنے ضمیر سے فرار ہے۔ ہمیں مجبور نہ کیجئے۔ ہم آپ کا حکم ہرگز نہ مانیں گے۔ اور یہ احساس کہ ہم اپنے عزیز ترین دوست اور آقا سے نافرمانی کر رہے ہیں۔ سوہان روح بن رہا ہے۔ للہ! ہم پر سے یہ پابندی اٹھا لیجئے۔

امام کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ خاموش اس شمع کو دیکھتے رہے جو دنیا میں انہوں نے آخری بار روشن کی تھی۔ اس کی روشنی ابھرتے سورج کی طرح دم بدم بڑھتی گئی۔

''میرے پیارو! یہ اب میری جنگ نہیں رہی' ہم سب کی جنگ ہے۔ ہمارا انجام جو بھی ہو ایک ساتھ ہوگا۔ آج ہم الگ الگ افراد نہیں۔ ایک مضبوط ارادہ ہیں۔ ان مٹ یقین ہیں۔ اس شمع کی طرح روشنی کا مخزن ہیں۔ فتح آخر میں ہماری ہوگی۔'' پھر انہوں نے باری باری سب کو گلے لگایا اور کہا۔'' آؤ اپنے بچوں سے بھی دو باتیں کر لیں۔''

اور شمع جگمگاتی رہی!

❑❑❑

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی

نوحہ

بانو نے کہا پیٹ کے یوں نعشِ پسر پر ہے ہے علی اکبر
تم مر گئے اور جیتی رہی ہائے یہ مادر ہے ہے علی اکبر

کیا سوتے ہو واری گئی کچھ ماں کی خبر ہے ننگا میرا سر ہے
ان ظالموں نے چھین لی سر سے میرے چادر ہے ہے علی اکبر

ارمان رہا دولہا بھی نہ تم کو بنایا وا حسرت و دردا
لائی نہ دلہن بیاہ کے گو میں تری مادر ہے ہے علی اکبر

واری گئی مارا گیا چھوٹا ترا بھائی جیتی رہی دائی
آغوش میری کر گیا خالی علی اصغر ہے ہے علی اکبر

سینے پہ تمہارے تو لگا نیزۂ بے پیر اصغر کے لگا تیر
والی کی ہے گردن پہ میرے چل گیا خنجر ہے ہے علی اکبر

کس بیکسی سے تم گئے اس دشت میں مارے قربان تمہارے
مر کر نہ ہوا غسل و کفن تم کو میسّر ہے ہے علی اکبر

اے میرے جواں اے مرے دکھ درد کے پالے اے گیسوؤں والے
عاشق مرے پیارے مرے جانی مرے دلبر ہے ہے علی اکبر

موتی بھی لعینوں نے یہاں لے لئے اس کے اور مارے طمانچے
دیکھو تو ذرا نیلا ہے اب تک رخ انور ہے ہے علی اکبر

اے ذوقؔ بیاں کی نہیں اب مجھ میں ہے طاقت سب کرتے ہیں رقت
جب پیٹتی ہے بانوئے ناشاد یہ کہہ کر ہے ہے علی اکبر

میر خورشید علی نفیسؔ

مہندی

عزیزوں آج کی شب قاسم بے سر کی مہندی ہے
ہوا جو قتل دولہا رن میں اس مضطر کی مہندی ہے

ملا ہشر بت کے بدلے جس کو اک قطرہ نہ پانی کا
یہ اس پیاسے کی مہندی ہے یہ اس بے سر کی مہندی ہے

ہوئی پامال جس کی لاش صبح عقد گھوڑوں سے
محرم میں یہ اس لخت دل شبر کی مہندی ہے

ہوئی بچپن میں کبریٰ رانڈ عاشورہ محرم کو
اڑاؤ خاک داماد سر بے سر کی مہندی ہے

صدا قبر حسن سے آرہی ہے ہائے قاسم کی
جہاں میں سید مسموم کے دلبر کی مہندی ہے

نہ شادی کی ملی لذت جسے دنیا میں اک دن بھی
وہ اس مقتول کی اس بیکس و مضطر کی مہندی ہے

کٹایا جس نے سر راہ خدا میں صبح شادی کے
یہ اس غازی کی مہندی ہے یہ اس صفدر کی مہندی ہے

حرم میں لاش جس کی دشت سے سہرا بندھی آئی
یہ آج اک ایک گھر میں اس مہ انور کی مہندی ہے

نفیس آنکھوں سے خون دل بہا دولہا کے ماتم میں
شہید ظلم ابن حضرت شبر کی مہندی ہے

مرزا محمد ہادی رسواؔ

نوحہ

بین بانو نے سب کو سنایا ہائے اصغر نے جنگل بسایا
ماں کو چھوڑا نہ کچھ رحم آیا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

میں تو ان کے لئے ہوں تڑپتی روح قالب میں اب ہے پھڑکتی
دھیان میرا نہ کچھ ان کو آیا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

دودھ کس نے انھیں واں پلایا میرے بچے کو کس نے بلایا
پانی مانگا تھا مجھ سے نہ پایا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

ماں کے بن چین کس طرح آیا کس نے چھاتی پہ اپنی سلایا
کیوں نہ پاس اپنے مجھ کو بلایا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

گھٹنیوں بھی نہ چلنے وہ پائے دانت پورے نکلنے نہ پائے
اتنے سے سن میں پیکان کھایا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

کیا کہے مرزا اب آہ و زاری ہائے بانو کی وہ بے قراری
کہہ کے بیٹی یہاں تک غش آیا ہائے اصغر نے جنگل بسایا

آشفتہؔ چنگیزی

نوحہ

کہتی تھی سکینہ میرے عمو کو بلا دو اچھے میرے بابا
مرجاؤں گی میں شکل مجھے ان کی دکھا دو اچھے میرے بابا

بابا یہ کہو مجھ سے میں تم پر گئی واری کیوں مجھ سے خفا ہو
جو میری ہو تقصیر وہ سب دل سے بھلا دو اچھے میرے بابا

بابا میرے عمو سے یہ کہہ دو کہ تم آؤ میں پیاسی رہوں گی
باز آئی خدا کے لئے پانی کو بہا دو اچھے میرے بابا

تم کہہ دو کہ مجھ سے ہوئی تقصیر چچا جان جو پانی کو بھیجا
اب اس کے عوض چاہو جو کچھ مجھ کو سزا دو اچھے میرے بابا

یہ شمر میرے کان سے اب چھینے ہے موتی اور ظلم ہے کرتا
تم کہہ دو چچا سے مجھے اب اس سے چھڑا دو اچھے میرے بابا

آشفتہؔ یہ کہتی رہی رو رو کے سکینہ جب تک جئے سرور
پر ایک دفعہ تم میرے عمو کو بلا دو اچھے میرے بابا

عرفان صدیقی

نوحہ

حشر برپا تھا کہ سبطِ مصطفی مارا گیا
بے وطن جنگل میں بے جرم و خطا مارا گیا

چشمۂ خوں سے بجھا کر لشکرِ اعدا کی پیاس
بادشاہِ کشورِ صبر و رضا مارا گیا

برگ، گل سے کون سا خطرہ کماں داروں کو تھا
پھول کی گردن میں کیوں تیرِ جفا مارا گیا

گونج کر گم ہو گئی صحرا میں اکبر کی اذاں
اڑتے اڑتے طائرِ صوت و صدا مارا گیا

کیسے کیسے سرفروش اس مہرباں کے ساتھ تھے
ایک ایک آخر سرِ راہِ وفا مارا گیا

تم نکل کر کس کا استقبال کرنے آئے ہو
شہر والو، دشت میں وہ قافلہ مارا گیا

چھٹ گیا آشفتگاں کے ہاتھ سے دامانِ صبر
سینۂ صد چاک پر دستِ دعا مارا گیا

پردۂ خیمہ تک آنے ہی کو تھی موجِ فرات
ناگہاں سقائے بیت مرتضیٰ مارا گیا

زندہ ہم سب نوحہ گر بس یہ خبر سننے کو ہیں
لٹ گئے رہزن، گروہِ اشقیا مارا گیا

میر مستحسن خلیق

نوحہ

سب مل کے کرو ماتم سلطان دو عالم آیا ہے محرم
سر پیٹتی ہے فاطمۂ خستۂ و پر غم آیا ہے محرم

ماتم بھی کرو تعزیہ خانوں میں بھی جاؤ اور خاک اڑاؤ
ساتھ آپ کے زہرا و علی کرتے ہیں ماتم آیا ہے محرم

یہ دن وہ ہیں جن میں مواشبیر کا لشکر خود بھی ہوئے بے سر
آتے ہیں ملک عرش سے کہتے ہوئے باہم آیا ہے محرم

سکّانِ سموات بھی کرتے ہیں یہ گفتار آپس میں وہ غمخوار
کرنے کو چلو سید ابرار کا ماتم آیا ہے محرم

یہ روز وہ ہیں نکلے ہیں مرقد سے پیمبر اور زہرا کھلے سر
آؤ کے عزاخانوں میں کرتے ہیں وہ ماتم آیا ہے محرم

عاشورہ کو اکبر نے سناں سینے پہ کھائی فریاد الٰہی
اصغر بھی ہوا ناوک بیدار سے بے دم آیا ہے محرم

عباس و علی اکبر و قاسم، علی اصغر قرباں ہوئے شہ پر
شبیر کا کوئی نہ رہا مونس و ہمدم آیا ہے محرم

دو فاطمۂ خستہ و غم خوار کو پرسہ تم اس کے پسر کا
دن ہیں یہ وہی جن میں موئے سید عالم آیا ہے محرم

مجلس کرو شبیر کی اور روؤ رلاؤ اور خاک اڑاؤ
مانندِ خلیق آؤ کرو شاہ کا ماتم آیا ہے محرم

نجم آفندی

نوحہ

زنداں سے چھٹ کے صاحب آزار آئے ہیں

کوفہ کو فتح کرکے عزادار آئے ہیں
قیدی ہلا کے شام کا دربار آئے ہیں
اشکوں کی نذر لے کے دل افگار آئے ہیں
زنداں سے چھٹ کے صاحبِ آزار آئے ہیں
اٹھو حسین عابد، بیمار آئے ہیں
ماتم زدوں کے قافلہ سالار آئے ہیں

قربانیوں کو صبر سے محکم بنادیا
سب کو تمہارے درد سے محرم بنا دیا
ہر اہلِ دل کو صاحب ماتم بنا دیا
ماتم زدوں کے قافلہ سالار آئے ہیں
اٹھو حسین عابد، بیمار آئے ہیں
صورت دکھاؤ طالب دیدار آئے ہیں

جس جس نے دل پہ داغ لیا تھا وہ ساتھ ہے
اکبر کا صبر جس نے کیا تھا وہ ساتھ ہے
اصغر کو نذر جس نے دیا تھا وہ ساتھ ہے
صورت دکھاؤ طالب، دیدار آئے ہیں
اٹھو حسین عابد، بیمار آئے ہیں
کھوکر اسے یہ بیکس و ناچار آئے ہیں

ساحل پہ کوئی روکنے والا نہیں رہا
کیا قافلہ حضور کا پیاسا نہیں رہا
اب گھاٹ پر فرات کے پہرا نہیں رہا
لے کر خبر یہ آپ کے غم خوار آئے ہیں
اٹھو حسین عابد، بیمار آئے ہیں
مجلس کریں گے دھوم سے زوّار آئے ہیں

راجہ الفت رائے الفتؔ

نوحہ

روتی تھی کھڑی مادر نادان میرے پیارے
حارث کے ہوئے کیونکر مہمان میرے پیارے

کس طور پھرے در در افسوس میرے دلبر
کوفہ میں رہے گھر گھر حیران میرے پیارے

کس جرم پہ مارا ہے سر تن سے اتارا ہے
ماں سے تو کہو ہو کر نالان میرے پیارے

ماں کو بھی پکارا تھا حارث نے جو مارا تھا
ہے ہے یہ گئی مادر قربان میرے پیارے

کچھ کھانا بھی کھایا تھا آرام بھی پایا تھا
قاتل کے گئے جب گھر نادان میرے پیارے

ظالم نے جو باندھے ہاتھ کس طور کٹی وہ رات
روتے رہے تم شب بھر لرزان میرے پیارے

خاموش ہو اے الفتؔ تھی بچوں پہ بس کلفت
کہتی تھی یہی رو کر ہر آن میرے پیارے

لالہ چھنّو لال خادم میاں دلگیرؔ

نوحہ

گھوڑے سے گرے جبکہ حضور شہ ابرار عباس علمدار
شہ بولے چلے کر کے مجھے بیکس و ناچار عباس علمدار

پہنچے جو سرِ نعش تو دیکھا شہ دیں نے یہ حال برادر
ہے فرق سے لے تابہ قدم خون میں سرشار عباس علمدار

شبیر نے سراس کا رکھا زانو پہ اپنے اور شانوں کو چوما
فرمایا سکینہ کے لئے ہو گئے افگار عباس علمدار

پھر بولے کہ اس نہر کا پانی جو تمہارے یاں ہاتھ نہ آیا
کوثر کی طرف جانے کو تم ہو گئے تیار عباس علمدار

عباس نے کی عرض کہ روتے ہیں جو یوں آپ اے قبلۂ عالم
زہراؑ کی یہاں روح سے شرماتا ہے ہر بار عباس علمدار

سرور نے کہا کیا نظر آتا نہیں تم کو میں روؤں نہ کیونکر
زہرا یہاں چلاتی ہے بادیدۂ خونبار عباس علمدار

مرضی ہو تمہاری تو تمہیں لے چلوں بھائی خیمہ میں یہاں سے
نادان سکینہ ہے بہت تشنۂ دیدار عباس علمدار

کی عرض یہ عباس نے یہ قصد نہ کرنا اے سبط پیمبر
ہووے گا سکینہ کے نہ اب رو برو زنہار عباس علمدار

شبّیر نے فرمایا سکینہ یہ کہے گی گر تم نہ گئے واں
آئے جو نہ تم پاس مجھے کرتے تھے کم پیار عباس علمدار

دلگیرؔ تو مداح جو ہے ابن علی کا یہ مجھ کو یقیں ہے
فرمائیں گے اب روضہ کا اپنے تجھے زوّار عباس علمدار

کنور دھنپت رائے محبؔ

نوحہ

چالیسواں جہان میں تشنہ دہن کا ہے
محتاج کربلا میں جو گور و کفن کا ہے

سینہ پہ نیزہ کھا کے جوانی میں مرگیا
چالیسواں یہ اکبر گل پیرہن کا ہے

بولی کلیجہ تھام کے بانو میں لٹ گئی
بتلاؤ لوگو پھول یہ کس کے چمن کا ہے

ہے ہے یہ میری گود کا پالا ہے نوجواں
ہے ہے سرور قلب یہ مجھ خستہ تن کا ہے

کبریٰ پکاری دیکھ کے قاسم کی نعش کو
کنگنے کی جانشان یہ دیکھو رسن کا ہے

ننھی سی مشک چھاتی پہ اور ہاتھ میں علم
بے سر لب فرات تن اس تیغ زن کا ہے

اب فکر دفن لاشۂ شبیر کیجئے
لاشہ پڑا بتول کے یہ گلبدن کا ہے

منھ دیکھ لوں اخی کا تو پھر دفن کیجیو
آج آخری یہ سامنا بھائی بہن کا ہے

آقا دراز عمر ہو فرزند کی مرے
دل سے محبؔ تو آپ ہوا پنجتن کا ہے

سید محمد اصطفا خورشیدؔ

نوحہ

اے ہنسلیوں والے لخت جگر ماں تم پہ ہو واری واویلا
اس ننھی مُنّی میت پر کیا یاس ہے طاری واویلا

سمجھی تھی نہ مادر لال مرے تم آؤ گے رن سے خون بھرے
اس شان سے بیٹا دم بھر میں پلٹے گی سواری واویلا

اس کوکھ جلی کو ہوش نہ تھا دل ٹھنڈا تھا بیہوش نہ تھا
پردیس میں آکر پھوٹے گی تقدیر ہماری واویلا

اِس تیر سے ماں کا دل نہ چھدا پیکاں نے نہ سینہ توڑ دیا
یہ داغ رہے گا سینہ میں جاں تم پہ نہ واری واویلا

سونپا تمہیں سونے جنگل میں یا چاند چھپایا بادل میں
تربت نہ بنائی سینہ میں میت نہ سنواری واویلا

پھٹتا ہے کلیجہ غربت پر ہوتا ہے لہو دل حسرت پر
ننھا سا گلا اور تیر ستم کیا زخم ہے کاری واویلا

چھنتا ہے لہو کی چادر سے کیا نورِ شہادت نامِ خدا
خوں بھر کے تو اصغرؑ اور ہوئی صورت تری پیاری واویلا

اللہ رے عالم حسرت کا وہ منظر خونی عبرت کا
ننھی سی زباں وہ خشک گلا اُف پیاس تمہاری واویلا

خورشیدؔ نہ پوچھا غربت نے دی آس نہ بڑھ کر حسرت نے
ماں درد کی ماری دکھیاری بن بن میں پکاری واویلا

رقیہ بانو رقیہؔ نگروروی

نوحہ

دھوم ہے کونین میں شبیر تیرے نام کی
خشک ہونٹوں سے شگفتہ کی کلی اسلام کی

لاشۂ کڑیل جواں تنہا اٹھا کر چل دئے
دیکھنا ہمت ذرا اس شاہ تشنہ کام کی

باتیں شہ کرتے تھے تنہائی میں دل کی پیاس سے
آ چکی ساعت قریں اب عصر کے ہنگام کے

لطف کیا تونے دیا اے دوپہر کی تشنگی
قدر ہوگی خلد میں گزرے ہوئے ایام کی

شمر سے بولے بحسرت کھول کر آنکھیں حسین
کس خطا پر ہے میری گردن شہ صمصام کی

مشغلہ جاتا رہا کہتی تھی ماں اصغر کے بعد
زندگی بیکار ہے اب مادرِ ناکام کی

کہتے تھے عابد ستم لاکھوں لعینوں کے سہے
سخت گزری ہے غریبوں پر مصیبت شام کی

جب بھرے دربار میں ظالم نے بلوایا ہمیں
پڑتی تھیں ذلت کی نظریں ہم پہ خاص و عام کی

کیا عجب مقبول نوحہ ہو رقیہؔ کا حضور
گود مقصد سے بھرے ہیں طالب انعام کی

شہید لکھنوی

نوحہ

اے حسین کربلا ،اے میہمان لکھنؤ
تیرے قدموں کی بدولت اب ہے شان لکھنؤ

درد سے مولا بھر آیا ہے ترے شاعر کا دل
دے اجازت تو زباں ہو ترجمان لکھنؤ

ٹھیس لگ جائے گی تیرے قلب زخمی کو شہا
ورنہ کر دیتا وضاحت سے بیان لکھنؤ

تیرے غم کے ماسوا یہ غم بھی ہے اس قوم کو
کیا تھے اور کیا رہ گئے ہیں ہادیان لکھنؤ

کل کی وہ شاہی عزا خانوں میں تیری مجلسیں
جن میں اب تک کچھ نظر آتی ہے شان لکھنؤ

آج کی غربت بیاں کرنے میں آتا ہے حجاب
اپنے ہاتھوں خود لٹا ہے کاروان لکھنؤ

کر چکی ہے ہم کو دنیا قوم مردہ میں شمار
ہاں مگر تیری عزا ہے روح و جان لکھنؤ

اے بچانے والے دین کبریا کی لے خبر
امتحاں کی باڑھ پر ہیں شیعیان لکھنؤ

اے علی کے لاڈلے دامن نہ چھوڑیں گے ترا
جس طرح سے چاہے کر لے امتحان لکھنؤ

بس چلے گر چاہنے والوں کا تیرے اے حسین
تیرے روضے کو اٹھا لائیں میان لکھنؤ

دو مہینے آٹھ دن تک تیرے ماتم میں حسین
عرش سے جا جا کے ٹکرائی فغان لکھنؤ

خلد میں شام و سحر کی مجلسوں کے واسطے
فاطمہ نے چن لئے دو خوش بیان لکھنؤ

اک دبیرؔ دو جہاں ہے اک انیسؔ کائنات
ایک روح لکھنؤ ہے ایک جان لکھنؤ

آج ہے ماتم کا تیرے آخری دن اے شہا
جاری ہے یہ بہار گلستان لکھنؤ

تیرے اکبر کے تصدق تیرے اصغر کے نثار
ہر جوان لکھنؤ ہر بے زبان لکھنؤ

یہ تو کہئے آپ کے بھائی کی یاں درگاہ ہے
ورنہ کب کا مٹ گیا ہوتا نشان لکھنؤ

دیکھ تو مڑ کر ذرا یہ اپنی رخصت کا سماں
کس طرح اجڑا پڑا ہے ہر مکان لکھنؤ

الوداع اے فاطمہ زہرا کے دلبر الوداع
ہر طرف گونجی ہوئی ہے یہ فغان لکھنؤ

جاتے جاتے میرے مولا یہ بتاتے جایئے
سال بھر تک کیا کریں گے ساکنان لکھنؤ

ہم غریبوں کی طرف سے چند آنسو کر قبول
اور دے سکتے ہیں کیا ہم مفلسان لکھنؤ

داغ ماتم اور یہ آنسو پیش کر دینا شہیدؔ
آخری شبیر جب آئے میان لکھنؤ

علامہ اقبال

جس نے پیمانِ وفا باندھا ہوالموجود سے
مل گئی اس کو رہائی بند ہر معبود سے

عشق سے مومن جہاں میں زندہ ہے مومن سے عشق
جیت کر بازی دکھا دیتا ہے ناممکن سے عشق

عقل ہے سفاک لیکن عشق ہے سفاک تر
خشک وتر میں پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

عقل کہتی ہے جہاں میں شاد رہ آباد رہ
عشق کہتا ہے خدا کا بندہ رہ آزاد رہ

تو ہے واقف معرکہ کے دن لبِ نہرِ فرات
کیا کیا تھا عشق نے عقلِ ہوس پرور کے ساتھ

وہ امامِ عاشقان، باصاف پورِ بتولؑ
سرِ آزاد و سرافرازِ گلستانِ رسولؐ

اللہ الہ بائے بسم اللہ کہلایا پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم اپنے عمل سے ہے پسر

وہ جسے کہتے ہیں ہم شہزادۂ خیر الملل
درشِ ختم المرسلیں جس کے لئے نعم الجمل

سرخرو ہے عشقِ غیرت مند اسکے خون سے
پائی اس مصرع نے شوخی اسکے ہی مضمون سے

درمیانِ ملتِ بیجا ہے روشن اس طرح
قل ہو اللہ احد قرآن میں ہے جس طرح

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید آفاق میں
آشکارا زندگانی ہی کی ہیں دو قوتیں

زندہ تر حق قوتِ بازوئے شبیریؑ سے ہے
دہر میں باطل عبارت رنج و دلگیری سے ہے

قطع جب رشتہ خلافت نے کیا قرآن سے
حریت نے ہاتھ دھویا اس دم اپنی جان سے

سمتِ قبلہ سے اٹھا وہ ابرِ بارانِ کرم
جس کو دنیا کہتی ہے سر جلوۂ خیر الامم

سرزمین کربلا پر آکے برسا اور گیا
لالہ اک صحرا کے ویرانے میں بویا اور گیا

جبر و استبداد کی ظلمت ابد تک مٹ گئی
آبیاری گلستاں کی اس نے اپنے خوں سے کی

خاک وخون میں وہ برائے دینِ حق غلطاں ہوا
یوں بنائے لا الہ کو دہر میں محکم کیا

مدعا اس کا حصولِ سلطنت ہوتا اگر
وہ نہ کرتا ہرگز اس ساماں کے ساتھ ایسا سفر

اسکے دشمن ریگِ صحرا کی طرح تھے بیشمار
ہم عدد یزداں کے تے ہمراہ اسکے جانثار

سرِّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا مظہر تھا وہ
یعنی اس اجمال کی تفصیل کا مظہر تھا وہ

کوہ کی مانند تھا اس کا ارادہ استوار
پائدار و تندسیر و کارساز و کامگار

تیغ اسکی عزتِ دیں کے لئے ہے اور بس
جہد و کاوش حفظِ آئیں کیلئے ہے اور بس

رب کا بندہ ہے مسلماں غیر کا بندہ نہیں
وہ کسی فرعون کے آگے سرافگندہ نہیں

فاش اس اسرار کو سوزِ دروں نے کر دیا
قومِ خوابیدہ کو بیدار اسکے خوں نے کر دیا

لا الہ کی تیغ جب لہرائی ہنگامِ وغا
خوں رگِ اربابِ باطل میں پکارا میں چلا

نقش الا اللہ کا بہرِ مسلماں لکھ دیا
صفحۂ عالم پر آزادی کا عنواں لکھ دیا

نکتۂ قرآں ہمیں سکھلا دیا شبیرؑ نے
خاک کو اس آگ سے شعلہ کیا شبیرؑ نے

مٹ گئی یادوں سے اپنی شوکتِ بغداد بھی
سطوتِ غرناطہ و شام و جہان آباد بھی

تازہ ہے تکبیر سے اس کی مگر ایماں ہنوز
اپنے دل کا تار اسکے زخمہ سے لرزاں ہنوز

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں جا تیز تر
اشک پہنچا دے ہمارے اسکی خاکِ پاک پر

اسداللہ خاں غالبؔ

نوحہ

ای کج اندیشۂ فلک کرامتِ دیں بایستی
علم شاہ نگوں شد، نہ چنین بایستی

تاچہ افتاد کہ بر نیزہ سرش گردانند
عزتِ شاہ شہیدان بہ ازین بایستی

حیف باشد کہ فتد خستہ زتوسن بر خاک
آنکہ جولانگہ او عرش برین بایستی

حیف باشد کہ ز اعدادمِ آبی طلبد
آنکہ سائل بہ درش روح امین بایستی

تازیان را بہ جگر گوشۂ احمد، چہ نزاع
وطنِ اصلی این قوم ز چین بایستی

ایہا القوم! تنزل بود ار خود گویم
میہمان بے خطر ازخنجر کین بایستی

سخن این است کہ در راہِ حسین ابن علی
پویہ از روی عقیدت بجبین بایستی

چشم، بدور، بھنگام تماشای رخش
رونما سلطنتِ روی زمین بایستی

داشت ناخواستہ در شکر قدو مش دادن
اگرش ملک و گر تاج و نگین بایستی

ای چون بفرمان خودآرای و خودبینی وبغض
آن نگردیدکہ ازصدق و یقین بایستی

بہ اسیران ستمدیدہ پس ازقتلِ حسین
دلِ نرم و منشِ مہر گزین بایستی

چہ ستیزم بقضا، ورنہ بگویم غالبؔ
علمِ شاہ نگون شد، نہ چنین بایستی

(منظوم ترجمہ مولانا ابن علی واعظؔ)

اے کج ایدیشہ فلک! حرمتِ دین لازم ہے
علمِ شاہ نگوں ہو! یہ نہیں لازم ہے

نوکِ نیزہ پہ سر اس کا نہ پھرایا جائے
عزتِ شاہ سوا اس سے کہیں لازم ہے

حیف گھوڑے سے گرے خاک پہ زخمی ہوکر
جس کا میداں ہو سرِ عرش بریں لازم ہے

حیف اعدا سے وہ ہو طالب یک جرعۂ آب
جس کے در کا ہو گداروحِ ا میں لازم ہے

کیا نزاع اہل عرب کو پسرِ احمد سے
وطن اس قوم کا ہو کشور چیں لازم ہے

بات چھوٹی سی ہے اے قوم! اگر میں یہ کہوں
میہماں بے خطر خنجر کیں لازم ہے

اتر پردیش حکومت کے ستمبر میں چھ ماہ مکمل ہونے پر خصوصی پیشکش

اتر پردیش ایک نئی سمت کی جانب گامزن

نجیب انصاری

موبائل:

اتر پردیش کی موجودہ حکومت کو عنان اقتدار سنبھالے چھ ماہ کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ اس دوران حکومت نے فلاحی اور ترقیاتی محاذوں کے ساتھ ساتھ امن و قانون کے محاذ پر بھی اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ الکشن کے دوران ریاست کو جرائم سے پاک کر دینے کا وعدہ کرنے والے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے امن و قانون کے مسئلہ پر توجہ دی۔ انہوں نے پولیس فورس کو جرائم کے معاملے میں سختی برتنے کی ہدایت دی۔ اس کے علاوہ انہوں نے پولیس محکمہ میں بنیادی تبدیلیاں بھی کیں۔ زون میں آئی جی کی جگہ اے ڈی جی اور رینج میں ڈی آئی جی کی جگہ آئی جی کی تعیناتی کے علاوہ اضلاع کی پولیس ٹیم میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب حکومت کو اپنی منشاء کے مطابق نتیجے ملنے لگے ہیں۔ ریاستی حکومت نے بدنام زمانہ اور انعامی مجرموں سے ٹکر لینے والے پولیس اہلکاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی اپنے خزانے کا منھ کھول دیا ہے۔ اب ایس پی سے لے کر پرنسپل سکریٹری (داخلہ) تک مجرموں پر زیادہ انعام کا اعلان کر سکیں گے۔ مجرموں کے منظم گروہوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ریاستی حکومت ایک نیا قانون 'یوپی کوکا' بنانے کی تیاری میں ہے۔ اس قانون کے نافذ ہو جانے کے بعد بدمعاشوں کے منظم گروہوں کے ساتھ اور سختی سے نمٹا جا سکے گا۔ ریاست میں غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد اور مافیاؤں کے خلاف تیزی سے کارروائی کی جا رہی ہے۔ اس میں اب تک ۱۳۸۵ افراد کے

ہندوستان کے وزیر اعظم جناب نریندر مودی اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی وارنسی میں مختلف ترقیاتی کاموں کے افتتاح کے موقع پر (۲۲ ستمبر ۲۰۱۷ء)

خلاف ۷۶۶ مقدمے درج کراتے ہوئے ۱۱۴۳ کے خلاف کارروائی کی گئی۔ اس کے علاوہ ۵۴ مجرموں کو قومی سلامتی قانون کے تحت پابند کیا گیا۔ ۱۱۴۵ مجرموں کے خلاف گینگسٹر ایکٹ کے تحت مقدمے درج کئے گئے اور ۹۹۷۳ مجرموں کے خلاف غنڈہ ایکٹ کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس کے علاوہ برسر روزگار خواتین، طالبات اور اپنے کام سے گھروں سے باہر نکلنے والی خواتین کو محفوظ ماحول مہیا کرانے کے لئے 'اینٹی رومیو اسکوائڈ' مسلسل سرگرم عمل ہے۔

جہاں تک فلاحی اور ترقیاتی محاذوں پر موجودہ حکومت کی کامیابیوں کا سوال ہے تو بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کی گاڑی ترقی کے ہائی وے پر برق رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ کسی ملک، قوم، ریاست یا مقام کی ترقی کی پہلی ضرورت نقل و حمل کے ذرائع کا وافر مقدار میں دستیاب ہونا ہے۔ ہمارے وزیر اعلیٰ اس نکتہ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کا زیادہ زور پلوں، فلائی اوورں، سڑکوں اور ایکسپریس وے کے لئے مطلوبہ آراضی میں سے ۷۰ فیصد سے زیادہ آراضی حاصل کی جا چکی ہے۔ اس ایک ایکسپریس وے کی تعمیر سے متعلق دیگر کارروائیاں بھی تیزی سے پوری کی جا رہی ہیں۔ ان کے مکمل ہوتے ہی اس کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔ اسی طرح بندیل کھنڈ کی ترقی کے لئے جھانسی سے جالون، اورئی، بیلا ہوتے ہوئے آگرہ لکھنؤ ایکسپریس وے تک چار لین کی قومی شاہراہ کی تعمیر کی منظوری حکومت ہند سے حاصل کر لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جھانسی، چترکوٹ، الٰہ آباد قومی شاہراہ کو چار لین میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رواں مالیاتی سال میں ریلوے اور برج کی تعمیر مکمل کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ موجودہ حکومت کی اب تک کی مدت میں ۷/ریلوے اوور برج کو اپروچ روڈ سمیت مکمل کر لیا گیا ہے۔ ان میں سنت کبیر نگر میں خلیل آباد، گھورکھپور، کانپور میں گووند پوری ریلوے اسٹیشن کے قریب، اناؤ میں ریلوے اسٹیشن کے قریب، ہاتھرس میں ٹونڈلہ، غازی آباد روڈ پر، ہاتھ میں ہی ساسنی، جنیسر روڈ پر جے پی نگر (امروہہ) میں امروہہ اٹاری روڈ پر اور مرادآباد میں مرادآباد ہری دوار روڈ پر تعمیر کئے گئے اوور برج شامل ہیں۔

ریاست میں سڑکوں کی حالت بیحد خراب ہوتی جارہی تھی۔ ان میں جابجا بنے گڑھوں کی وجہ سے ان پر چلنا بیحد دشوار تھا۔ وزیر اعلیٰ نے عوام کی اس پریشانی کو سمجھا اور انہوں نے افسروں کو حکم دیا کہ ریاست کی سبھی سڑکوں پر سے گڑھے ختم کئے جائیں گے۔ ان کے حکم کی تعمیل میں ریاست کی تقریباً ایک لاکھ اکیس ہزار کلومیٹر سڑکوں میں سے ۸۳/ہزار پانچ سو کلومیٹر سے زیادہ سڑکوں کو گڑھوں سے پاک کیا گیا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو نقل وحمل کے میدان میں سب سے اہم قدم لکھنؤ میں میٹرو ریل کا آغاز ہے۔ مستقبل قریب میں یہ میٹرو ریل لکھنؤ کی لائف لائن بنے گی۔ اس سے اپنا شہر ایک نئی رفتار کے ساتھ دوڑے گا۔ میٹرو روٹ کے ترجیحی سیکشن پر ۵/ستمبر کو میٹرو ریل کا افتتاح وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی مرکزی وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ اور گورنر جناب رام نائیک نے ہر جھنڈی دکھا کر کیا۔ فی الحال یہ ٹرین ٹرانسپورٹ نگر سے چارباغ تک ساڑھے آٹھ کلومیٹر کے حصے میں چل رہی ہے۔ یہ اپنے مسافروں کو مقررہ وقت پر منزل مقصود پر تو پہنچائے گی ہی ساتھ ہی انہیں پوری طرح محفوظ بھی رکھے گی۔ نہ ایکسیڈنٹ کا خوف اور نہ گاڑیوں کا شور۔ لکھنؤ میٹرو سے لوگوں کو ایک نہیں کئی فائدے ملیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سے سڑکوں پر گاڑیوں کا دباؤ ۳۰ سے ۴۰ فیصد تک کم ہوجائے گا۔ ساتھ ہی فضائی آلودگی میں بھی خاطر خواہ کمی آئے گی۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی نے اپنی حکومت کے چھ ماہ پورے ہونے پر نوجوانوں کو یقین دہائی ہے کہ اب انہیں بے روزگاری کا زہر نہیں پینا پڑے گا۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ میں یوم اساتذہ کے موقع پر منعقد ریاستی اساتذہ کی اعزازی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے (۵/ستمبر ۲۰۱۷ء)

اب حکومت ان کے لئے بڑے پیمانے پر ملازمتوں کے دروازے کھولنے جارہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سبھی تقرریاں شفاف طریقے سے ہوں گی۔ وزیر اعلیٰ کو احساس ہے کہ گزشتہ حکومتوں میں ملازمتوں میں جانبداری، ذات پرستی، بدعنوانی، دھاندھلی اور تفرقہ پروری کا بول بالا تھا اور باصلاحیت نوجوانوں کے ساتھ ناانصافی ہورہی تھی۔ اسی کے پیش نظر ان کی حکومت نے گروپ بی کی نان گزیٹیڈ اسامیوں گروپ سی اور ڈی کی اسامیوں کے لئے انٹرویو کا نظام ختم کردیا ہے۔ اب باصلاحیت نوجوانوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی اور سبھی بے روزگار دیگر روزگار یا خود روزگار کے مواقع بھی مہیا کرائے گی۔ ملازمتوں کے علاوہ حکومت کا زور فروغ ہنرمندی پر بھی ہے۔ حکومت کی کوششوں سے اب تک چھ لاکھ سے زیادہ نوجوانوں کا اس میں رجسٹریشن کرایا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ نوجوانوں کا رجسٹریشن کرکے انہیں روزگار یا خود روزگار سے جوڑنے کا کام چل رہا ہے۔

کسانوں کی بدحالی پر حکومت کی گہری نظر ہے۔ ان کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے حکومت مسلسل کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ۲۰۲۲ء تک کسانو کی آمدنی دوگنی کرنے کا روڈ میپ تیار کرلیا ہے۔ اس سلسلہ کا سب سے اہم قدم مقروض کسانوں کی قرض معافی ہے۔ ریاست کے تقریباً ۸۶/لاکھ کسان جنہوں نے ۳۱/مارچ ۲۰۱۶ء تک فصلی قرض لیا ہے۔ ان کے ایک لاکھ کی رقم تک کے قرض معاف کئے جارہے ہیں۔ بینکوں کے توسط سے پہلے مرحلے میں سات ہزار تین سو ساٹھ کروڑ روپئے ۱۱/لاکھ ۹۳/ہزار مستفیدین کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی کارروائی مکمل کی جاچکی ہے۔ اضلاع میں کیمپ لگا کر انچارج وزراء کے ہاتھوں قرض معافی کے سرٹیفکٹ تقسیم کئے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ گنا کسانوں کو گنے کی قیمت کی تیزی سے ادائیگی کرتے ہوئے ۸۷-۳۸۶-۲۵ کروڑ کے برعکس ۷۶-۸۴۳-۲۳ کروڑ کی ادائگی چینی ملوں سے کرائی گئی۔ اس کے علاوہ ۳۷/لاکھ میٹرک ٹن ریکارڈ گنیہوں کی خرید سے کسانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جب کہ پہلے صرف ۵-۷ میٹرک ٹن ہی خرید ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دھان خرید کے لئے شفاف

نظام نافذ کیا جارہا ہے۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی یوپی میں صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لئے مسلسل کوشاں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ زیادہ فعالیت کے ساتھ مثبت انداز میں کام کرتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ریاست کے ۲۸ ؍اسپتالوں میں ای-ہاسپٹل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لکھنؤ کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی اسپتال میں ای ہاسپٹل پروجیکٹ کا آغاز ہوچکا ہے۔ اس سے ان اضلاع میں جاپانی انسیفلائٹس سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سیرئس مریضوں کو جلد اسپتال پہنچانے کے لئے اتر پردیش کے سبھی اضلاع میں جدید ترین آلات سے آراستہ ۱۵۰ ؍ایڈوانس لائف سپورٹ ایمبولنس شروع کی گئی ہے۔ دواؤں کی خرید میں بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے سینٹرل کارپوررییشن بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اسی سے ۸۰۰ ؍کروڑ کی دوا کی خرید سے دوگنے مریضوں کو فائدہ پہنچایا جا سکے گا۔ ہمارے وزیر اعلیٰ سیرئس مریضوں کے تئیں بیحد حساس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اب تک پانچ ہزار دوسو نو اسی غریب مریضوں کو مالی امداد دے چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ ریاستی حکومت اپنے فعال وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی قیادت میں ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لئے تو سرگرم ہے ہی ساتھ ہی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بھی انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ شہروں میں اب تک اپنے نجی گھر سے محروم افراد کو پی ایم رہائشی اسکیم کے تحت مکان مہیا کرانے کے لئے حکومت تیزی سے کام کر رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت پانچ لاکھ مکان بنانے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی یوپی حکومت پرعزم ہے۔ ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت فروغ ہنرمندی کے لئے چھ نئی آئی ٹی آئی اور ۲۴ ؍انٹر کالجوں کی عمارتوں کی تعمیر مکمل کرائی گئی۔ مدرسہ بورڈ کے کام کاج میں شفافیت اور آسانی پیدا کرنے کے مقصد سے نئے پورٹل کا آغاز کیا گیا۔ حکومت سے امداد یافتہ مدرسوں میں اب درجہ چہارم کے ملازمین آؤٹ سورس سے رکھے جاسکیں گے۔

بجلی ہر طرح کی ترقیاتی سرگرمیوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ یوگی سرکار نے ۲۴ ؍گھنٹے بجلی کی سپلائی کو یقینی بنانے کا عہد کرتے ہوئے اسکی سپلائی بلا تفریق کرنے کا نظام نافذ کیا ہے۔ شہروں کی طرح دیہی علاقوں میں بھی رات میں بلا رکاوٹ سپلائی کی جارہی ہے۔ ضلع ہیڈکوارٹر کو ۲۲ ؍سے ۲۴ ؍گھنٹے بجلی، تحصیل ہیڈکوارٹر کو ۲۰ ؍گھنٹے اور مواضعات کو ۱۸ ؍گھنٹے بجلی کی سپلائی کو یقینی بنایا جارہا ہے۔ بجلی کے زمرے میں غریبوں کے لئے ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے دیہی علاقوں کی طرح شہری علاقوں میں رہنے والے غریب کنبوں کو بھی مفت بجلی کنکشن دینے کی سہولت دی جارہی ہے۔ گزشتہ پانچ ماہ میں ہی ۱۶ ؍لاکھ کنبوں کو بجلی کے کنکشن دئے گئے۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ میں قومی یوم کھیل کے موقع پر مسز گارگی یادو کو رانی لکشمی بائی ایوارڈ سے نوازتے ہوئے (۲۹ ؍اگست ۲۰۱۷ء)

تعلیم پر یوگی حکومت نے خصوصی توجہ دی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے خود 'اسکول چلو مہم' کا آغاز کر کے یہ اشارہ دے دیا کہ ان کی حکومت تعلیم کے تئیں کتنی سنجیدہ ہے۔ ان کے اس اقدام کا ہی نتیجہ ہے کہ بیسک اسکولوں میں اب تک ایک کروڑ ۵۳ ؍لاکھ بچوں کا داخلہ کرایا جاچکا ہے جب کہ گزشتہ برس یہ مقدار محض ایک کروڑ ۳۶ ؍لاکھ تھی۔ سبھی سرکاری اور سرکار سے منظور شدہ اسکولوں میں درجہ یکم سے ہشتم تک مفت نصابی کتابوں اور یونیفارم کی تقسیم کی جا چکی ہے۔ سردی آنے سے پہلے پہلے ان طلبہ و طالبات کو جوتے موزے، اسکول بیگ اور سوئٹر دینے کی کارروائی تیزی سے چل رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں اہلیا بائی مفت تعلیمی اسکیم کے تحت گریجویشن تک مفت تعلیم دینے کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ سبھی ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مفت وائی فائی کی سہولت مہیا کرائے جانے کی کارروائی تیزی سے چل رہی ہے۔

غرض کہ یوپی کی موجودہ حکومت ریاست کی ہمہ جہت ترقی، تعلیم کے فروغ، بجلی کی دستیابی، کسانوں کو سہولتیں، انفرااسٹرکچر کی فراہمی، ہنرمندی کے فروغ کے مواقع، سماجی بہبود، طلب وصحت کے میدان میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں، نقل وحمل کے وافر ذرائع، خواتین کے تحفظ، صنعتی ترقی، شہری و دیہی ترقی کے میدان میں عوام کو آسانیاں فراہم کرنے کے لئے پورے تن من دھن اور نیک نیتی، دلجمعی اور خلوص کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

❑❑❑

آپ کے خطوط

اگست ۲۰۱۷ء کا ماہنامہ نیا دور، شہر نشاط' کلکتہ کے جواں سال چیف ایڈیٹر محمد التمش خالد کے توسط سے نظر نواز ہوا۔ رسالہ کو دیکھتے ہی طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ کچھ دنوں قبل نیا دور جناب وضاحت حسین رضوی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ انہوں نے اسے خوبصورت اور میعاری بنانے کے لئے بھر پور کاوشیں کیں۔ اب ادارت کی ذمہ داری آپ کے کاندھے پر آگئی ہے۔ تازہ شمارہ پڑھتے ہی آپ کی ذہانت اور کوشش کا قائل ہونا پڑا۔ آپ نے نیا دور کو نئی زندگی اور توانائی بخشی ہے جس کی ستائش ضروری سمجھتا ہوں۔

عظیم افسانہ نگار عصمت چغتائی کی تصویر نے سرورق کو دلکش بنا دیا ہے۔ اردو کے عظیم اور نامور شاعروں وادیبوں کے صفحہ میں تاریخ پیدائش اور وفات مع تصاویر نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں یہ اردو کے قارئین، طلباء شعرا و ادبا کے لئے نئی چیز ہے اس سلسلہ کو جاری رکھئے۔ معروف غزل گو اور ممتاز نغمہ نگار شکیل بدایونی کی تاریخ پیدائش ۳/اگست ۱۹۱۶ء ہے۔ کلیات شکیل میں تاریخ پیدائش یہی ہے۔ شاید یہ کمپوزر کی بھول ہے۔ اداریہ پسند آیا جس میں آپ نے اعلان کیا ہے کہ مشہور شاعر و نغمہ نگار ندا فاضلی اور مقبول ترین شاعر بشیر بدر جو بستر علالت پر ہیں ان حضرات کے فن اور شخصیت پر گوشہ نکلنے والا ہے، یہ اعلان پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میرے خیال میں آئندہ بھی آپ فیض، فراق، جمیل مظہری، جگر مرادآبادی، رضا علی وحشت، شاد عظیم آبادی، پرویز شاہدی، شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، نشور واحدی، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، شہریار، وحید اختر اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کا گوشہ نکالنے کی سعی کریں گے۔

یہ ایک درخواست ہے گوشہ عصمت چغتائی میں قاضی عبدالستار، شمیم حنفی، علی احمد فاطمی، صبیحہ انور، سلمان عبدالصمد اور ندا موید کے مقالات شمارہ کی جان ہیں۔ بلاشبہ عصمت آپا نے اردو افسانے کو نئی فکر، نیا تصور اور نئی سمت عطا کی ہے۔ ان کے فن پر مذکورہ ادباء نے بھر پور تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری کا مضمون'' تحریک آزادی اردو خطوط لائق'' ستائش ضرور ہے لیکن اس میں کچھ تشنگی باقی رہ گئی ہے۔ آزادی کی جنگ میں شہر بنگالہ نواب سراج الدولہ، شیر میسور ٹیپو سلطان، نواب حیدر علی، بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی، میر قاسم، تانتیہ ٹوپے، بھگت سنگ، اشفاق اللہ خان شہید، چندر شیکھر آزاد، رام پرشاد بسمل، جنرل بخت خان، جنرل شاہنواز خان اور مولانا مہر جر مکّی کے علاوہ خانقاہوں کے سیکڑوں صوفیائے کرام اور سجّادہ نشین حضرات نے بھی حصہ لیا تھا۔ آزاد ہند فوج کے کرنل نظام الدین کی قربانیوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ منظوم حصّہ میں مخمور کاکوردی، رباب رشیدی، شہپر رسول، ظفر اکبر آبادی، اختر شاہ جہاں پوری، رہبر سلطانی، پی پی سرواستو رند، الیاس چشتی، کیفی سنبھلی، طارق عمر، آصف جاہ، جلیس نجیب آبادی اور اظہار وارثی کی نگارشات میں جمالیاتی و رومانی حسن کے ساتھ حالات حاضرہ پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے جس میں لفظوں کی تارہ کاری دل و دماغ کو فرحت بخشی ہے۔ بیشتر افسانے خوبصورت اور دلوں کو چھو لینے والے ہیں۔ آپ نے نئے اور پرانے قلمکاروں کی مرصع نگارشات کو نیا دور میں شامل کر کے اسے حسین اور دلکش بنا دیا ہے۔ اتنا خوبصورت رسالہ منظر عام پر لانے کے لئے آپ کی جرأتِ رندانہ کو سلام۔

مشتاق جاوید

چیئرمین اردو پروگریسو سوسائٹی/ ادبی سنگم مٹیا برج، کولکاتا

میں پچھلی دو دہائیوں سے نیا دور کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مگر حالیہ کچھ شمارے جو آپ کی ادارت میں شائع ہوئے، وہ چونکانے والے ہیں۔ آپ نے نیا دور کا دور بدل دیا۔ تمام مشمولات کا انتخاب معیاری اور عمدہ ہے۔ اگست کا شمارہ میرے سامنے ہے جس کا ہر شمارہ آپ کی قابلیت کی گواہی دے رہا ہے۔ آپ کی 'اپنی بات' میں ای ایڈیشن کو شروع کرنے کا ذکر قابل مبارکباد ہے۔

ریحان ناصر

دیار نور، محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر

نیا دور کے یکے بعد دیگرے کئی شمارے دستیاب ہوئے۔ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مشمولات کا انتخاب بہترین ہے۔ ستمبر کے شمارے میں اتر پردیش کے گورنر رام نائیک کا گوشہ بہت معلوماتی ہے اور اتر پردیش کے گورنر کا اردو زبان سے اتنا لگاؤ دیکھ کر کافی حیرت بھی ہوئی۔ اگر اسی طرح کی شخصیات پر چند شمارے مزید شائع کئے جائیں تو بہترین قدم ثابت ہوگا۔

کوکھ کی تلاش ایک بہترین کہانی ہے جو ہمارے سماج کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے۔ سرنگ بھی بہترین کوشش ہے۔ گزشتہ لکھنؤ تو آپ کے شمارے کا سب سے بہترین کالم ہے۔ امید ہے یہ آگے بھی اسی طرح جاری رہے گا۔ باقی نظمیں اور غزلیں بھی عمدہ ہیں۔

فیروز علی

گولہ گنج، لکھنؤ

نیا دور پوری طرح سے اپنی شکل تبدیل کر چکا ہے۔ کافی دنوں کے بعد نیا دور کی شکل دیکھی اور اس میں شامل مضامین اور افسانوں کو دیکھا تو تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ اردو کا یہ عظیم رسالہ اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ اب شدت سے آئندہ شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ دیگر کالم بھی قابل مطالعہ ہیں۔

منہال حیدر

بارہ بنکی

لکھنؤ میں ۱۰ر صفر کو آصفی امامباڑے میں برپا ہونے والے بہتّر تابوت کا ایک منظر

لکھنؤ میں ساتویں محرم کے موقع پر جناب قاسمؑ ابن حسنؑ کی مہندی کے جلوس کا ایک منظر

پہلی محرم کو لکھنؤ کے شاہی جلوس کے دوران سبیل کا ایک منظر